...وصی بیاد میکش کاشمیری

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز

ماہنامہ

شیرازہ

سرینگر، کشمیر

جلد: ۴۵	اشاعتِ خصوصی بیادِ میکش کاشمیری	شمارہ: ۱

نگراں:

ڈاکٹر رفیق مسعودی

مدیر:

محمد اشرف ٹاک

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر : سیکرٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

کمپوزنگ : اشتیاق احمد میر، تالاب تلو، جموں

مطبع : میکاف پرنٹرس، نئی دہلی

تصاویر: غلام محی الدین

شیرازہ میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں،
اُن میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈیمی یا
ادارے کا کلاً یا جزواً اتفاق ضروری نہیں

قیمت : ۱۰ روپے

سَرِوَرق : شبیر احمد

خط وکتابت کا پتہ:

محمد اشرف ٹاک

ایڈیٹر، شیرازہ، اردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

سرینگر/جموں

فہرست

حرفِ آغاز

جو شیخ و برہمن دونوں کی جاں ہے		وہ اے میکشؔ مری اُردو زبان ہے

بَسا اَوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کی خوبیوں کا دل سے اعتراف اس شخص کے اِس جہانِ فانی سے رَخصت ہونے کے بعد ہی کیا جاتا ہے۔ یہی حال اُردو کے محب اور صاحبِ طرز سخنور کیلاش ناتھ کول میکشؔ کاشمیری کا بھی ہے۔ خلوص کے سمندر اور دل کے قلندر میکشؔ کاشمیری، بظاہر جتنے سیدھے سادے اور لااُبالی تھے لیکن جب سخن سرا ہوتے تو اندازہ ہوتا کہ یہ شخص گنجِ اسرار ہے۔ میکشؔ اُردو سے دیوانگی کی حد تک محبّت کرتے تھے۔ اَپنے پہلے مجموعۂ کلام 'بالِ ہُما' میں وہ رقمطراز ہیں کہ بعض حضرات اِس کج فہمی میں مبتلا ہیں کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے جبکہ اُن کے شانہ بشانہ غیر مُسلموں نے بھی گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار، کوثر میں ڈھلی ہوئی اس ٹکسالی زبان کی ترویج واشاعت اور فروغ کیلئے نمایاں رول اَدا کیا ہے اور چمنستانِ شعر وادَبِ اُردو کی خونِ جگر سے آبیاری کی ہے۔ کر رہے ہیں اور بدستور کرتے رہیں گے

اِسی میں ہوگی خدا سے بھی گفتگو مے کش		کہ روزِ محشر بھی ہوگی مری زبان اُردو

ہمیں اس بات کا شدّت سے احساس ہے کہ میکشؔ کاشمیری کے جیتے جی اُن کی اتنی پذیرائی نہیں کی جاسکی جسکے وہ قرار واقعی مستحق تھے۔ امید ہے کہ 'شیرازہ' کی اِس اشاعتِ خصوصی کی صورت میں اُن کے تئیں خراجِ تحسین ہمارے اعتراف گناہ کا بوجھ کچھ کم کر سکے گا۔ حالانکہ بقولِ میکشؔ ۔

مرگِ مے کش سے جو ہُوا پیدا		پُر کسی سے بھی وہ خلا نہ ہُوا

ہمیں اِس اشاعتِ خصوصی کے بارے میں آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔

● ....ڈاکٹر رفیق مسعودی

☆☆☆

اکادمی کے جموں دفتر میں میکشؔ کاشمیری کی یاد میں منعقدہ تقریب آر۔ کے بھارتی اظہار کر رہے ہیں۔ ایوانِ صدارت میں ڈاکٹر ظہورالدین محمد یوسف ٹینگ، ڈاکٹر رفیق مسعودی، کرنل سنجیو کول اور امین بنجارہ

میکشؔ کاشمیری کی تصویر پر اُن کے فرزند کرنل سنجیو کول اور میکشؔ کاشمیری کی اہلیہ گلہائے عقیدت نذر کر رہے ہیں

میکش کاشمیری کے شعری مجموعے شہپر طاؤس کی رونمائی (دائیں سے بائیں) آر۔ کے بھارتی، ڈاکٹر ظہور الدین،
محمد یوسف ٹینگ، ڈاکٹر رفیق مسعودی، کرنل کول اور امین بنجارہ۔

محمد یوسف ٹینگ*

مے اخلاص کا متوالا...... میکشؔ کاشمیری

پنڈت کیلاش ناتھ کول میکشؔ کو اپنے کاشمیری ہونے پر بڑا اصرار تھا۔ حالانکہ وہ کشمیری زبان بول نہیں سکتا تھا اور میرے لئے ایسا کرنا کشمیری ہونے کی اکلوتی نہ سہی مگر مستند پہچان ہے۔ لیکن انہیں کشمیر سے بہت محبت تھی اور میکشؔ جنتِ ارضی کی ترکیب باندھ کر کشمیر کے سفینے سے اِس طرح بندھے رہنا چاہتے تھے جس طرح ڈل جھیل میں موٹر بوٹ کے ساتھ رَسی میں بندھا ہوا کھلاڑی اُپنے تختے پر پاؤں گاڑ کر کرتب دکھاتا ہے۔ لیکن ایک بات ظاہر تھی کہ اس کے اجداد کشمیر سے اس پر گزرنے والی بار بار کی آفتوں میں سے کسی وقت کشمیر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ جموں جانے والے پنڈت جموں پہنچ کر اَپنے کشمیری گوتر کو ترک کر کے شرما کی میرانی ٹوپی پہن لیتے ہیں مگر کیلاش ناتھ کول کسی پرانے کشمیری رئیس کے کاندھوں پر تہہ کیے ہوئے دوشالے کی طرح اس کی اصلیت کا بیان حلفی دہراتا رہتا تھا۔

میں نے کیلاش ناتھ کو اِس صدی کی ساتویں دہائی میں دیکھا جب میں اکادمی کا ملازم بنا اور ۲۸ رجنوری کے آل انڈیا اردو مشاعرہ (اکادمی کا یہ پروگرام آج بھی قائم ہے اور جھیل ڈل کے وونٹہ کدل کی طرح آس پاس کی طوفانی ہواؤں میں

☆......T-3- تلسی باغ۔ سرینگر

کچھ استقلال کا بھرم بناتا ہے) کے سلسلے میں مجھے جموں بلالیا گیا۔ اُن دنوں ابھینو نہیں بنا تھا اور اسمبلی کے نئے نئے ہال میں اس کی بساط جمتی تھی۔ اُن دنوں اردو میں مشاعرے کے اچھے شاعر زندہ تھے۔ بسملؔ شاہ جہاں پوری، فناؔ نظامی، بیکلؔ اُتساہی، نشورؔ واحدی وغیرہ وغیرہ۔ اُدھر جموں میں ابھی اُردو پڑھی ہوئی نسل کے لوگ اچھی تعداد میں تھے۔ انہوں نے وہاں ملکہ پکھراج کی غزل کی گرمی بھی بھانپی تھی اور کندن لال سہگل کے گلے کی مٹھاس کا رَس بھی پیا تھا۔ اس وقت جموں سے شائع ہونے والے اُردو اخبارات، روزنامے اور ہفتہ وار دونوں کی تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ تھی۔ اگرچہ کچھ اخبار صرف افسروں سے تاوان کی وصولی سے ہی چلتے تھے اور کچھ اور کیلئے یہی کافی تھا کہ انہیں سرکاری پارٹیوں میں جانے کا دعوت نامہ ملے۔ لیکن پھر بھی جموں کے لوگوں کی پیاس اُردو صحافت کا دریائے لطافت ہی بجھاتا تھا۔ ابھی وہاں کے انگریزی اخبار زمانے کے بطن میں ہی پَل رہے تھے حالانکہ اَب اُن کے کلش جموں ہی نہیں سرینگر میں بھی چمکتے ہیں اور جموں میں اردو اخبارات کا حال معشوقہ کے اس سینہ بند کا سا ہو گیا ہے جسے چھُونے اور دیکھنے کے لئے آپ کو پچھواڑوں اور اَندھیری گلیوں کے چکر کاٹنا پڑتے ہیں۔ یہ جو چارپائیوں کے پیچھے سُوکھنے کیلئے آویزاں کئے جاتے ہیں۔

خیر یہ بات ۲۸ جنوری کے مشاعرے کی ہو رہی تھی۔ اسمبلی کا بڑا ہال شائقین سے لبریز ہو رہا تھا۔ ان میں شعر کے ایسے رسیا بھی موجود ہوتے تھے جو قلم کاپی ساتھ لاتے تھے۔ کسی شاعر کا شعر پسند آیا تو پہلے اس کی دل کھول کر داد دیتے تھے اور پھر شاعر کو مکرّر ارشاد کیلئے آمادہ کر کے اُسے اپنی کاپیوں میں نوٹ کر لیتے تھے۔ کیلاش ناتھ کول اُن دنوں جوان۔ تھے۔ بہت وضعدار اور مست ملنگ انداز۔ قد

نکلتا ہوا تھا اور جسم نستعلیق، مونچھوں کا رنگ بھجنگ اور طرز بھی سب سے الگ تھا اور سب سے بڑی تفاوت......آواز میں ان کی ناک کے ایک 'دو سُر' بھی شامل رہتے تھے۔ اس Nasal Quality سے اِن کا لب ولہجہ الگ ہو جاتا تھا اور سامع کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ وہ اونچے لہجے میں پڑھتے تھے اور کسی کاغذ کی مدد کے بغیر۔ چنانچہ جب وہ شروع ہو جاتے تھے تو ہال کی بالعموم ساکت جھیل میں طلاطم پیدا ہونے لگتا تھا۔ انہیں پڑھتے وقت بیچ بیچ میں فقرہ بازی کرنے کی عادت تھی۔ انکی 'ناکیلی آواز' اس پر اور غضب ڈھاتی تھی اور سامعین کے ساتھ وہ ایک دوسُوتی رشتے میں بندھ جاتے۔ کچھ وہ فرما رہے ہیں اور کچھ قارئین اس پر تضمین کر رہے ہیں۔ واہ واہ اور تالیوں کے ساتھ قہقہوں کے پکے راگ بھی مچل رہے ہیں۔ کیلاش ناتھ بڑے صوفی منش قسم کے آدمی تھے اور معصومیت کی حد تک دُنیا ناشناس۔ وہ ان قہقہوں وغیرہ کو آفرین و تحسین کی لہریں سمجھتے تھے اور پھر آواز بلند کرنے کے ساتھ ہی انکا 'ناکیلا' سر بھی بہت اُونچا گونجتا تھا۔ اس طرح ہال میں ایک تموج چھا جاتا۔ ہر ایک چیز اُلٹ پلٹ اور اوندھی ہو جاتی تھی اور میکشؔ صاحب جب رُخصت ہوتے تو واہ واہ، کی آوازوں، تالیوں کی تھاپ، قہقہوں کی آتش بازی کے ساتھ سیٹیوں اور کیٹ کالز کی غیر احتیاطیاں بھی چھت کو پھاڑتی تھیں۔ ان کے بعد آنے والے کئی شاعر اس اِترتی ہوئی آندھی کی زد میں آ جاتے اور مشاعرہ سنبھلتے سنبھلتے ہی پھر واپس اَپنے معمول پر آ جاتا تھا۔ میں نے ہمیشہ ان کے اس انداز کو بہت اچھا مانا کیونکہ وہ مصنوعی بندشوں کو توڑنے اور سامعین کو ظاہر داریاں ترک کر کے اپنی پوری انسانی جگمگاہٹ میں لاتے تھے اور منورنجن کی تقریبات کی اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے؟

لیکن اُپنی روزمرّہ کی زندگی میں وہ دوسری وضع قطع رکھتے تھے۔ مہذّب، خوددار، منکسر المزاج اور نہایت پرخلوص۔ ان پر تنگ دستی کے دَور بھی آئے لیکن ان کی خاص وضع میں فرق نہیں آیا۔ اُچکن اور بہت دِلربا پنڈت ٹوپی (اسکو گاندھی ٹوپی سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ شائستہ کشمیری پنڈت گاندھی ٹوپی کے رواج سے بہت پہلے پہنتے تھے۔ اس کے کناروں پر کشمیر کی خوبصورت سوزن کاری کی طرحیں پھولتی ہوئی موجود ہوتی تھیں)۔ اس کے علاوہ تنگ پاجامہ۔ لیکن ایک دن میری نظر ان کی جوتی پر پڑی۔ صاف اور چمکتی ہوئی۔ لیکن ایک طرف کٹی پھٹی۔ میرے دل میں ایک وضعدار شخص کے اس ماجرے پر جیسے برچھی چل گئی۔ لیکن میں وہ لوہے کا جگر کہاں سے لاتا کہ ان کی توجہ اس طرف مبذول کر لیتا۔ شائد میرے ذہن میں میرتقی میر کے اِس شعر کی کیفیت موجود تھی۔

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں
میرؔ کو تم عبث اُداس کیا

میکشؔ کاشمیری ریڈیو میں اناؤنسر تھے اور جب سال بھر میں کبھی ایک بار مجھے وہاں کا بُلاوا آجاتا تو میکشؔ صاحب میری ریکارڈنگ کرتے۔ وہ اِس دوران میرے ساتھ کچھ اس تعظیم اور تہذیب کا سلوک کرتے کہ مجھے تمثیلی پیرائے میں واقعی اپنے آپ کو سوئی چبھونی پڑتی کہ کیا میں واقعی جاگ رہا ہوں؟ وہ اس توجہ اور تکلّف سے میرے اُٹھنے بیٹھنے بولنے چالنے کی فکر کرتے جیسے میں کوئی شہزادہ ہوں ورنہ خود مرزا غالبؔ...... جب سٹوڈیو سے باہر نکلتا تو وہ آگوائی کرتے اور دروازہ کھولتے۔ چائے لگی ہوئی ہوتی اور وہ باہر تک ساتھ آتے۔ نظریں جُھکا کر اور ہمہ تن ادب، جیسے میں کوئی پہنچا ہوا روشن شاس ہوں۔ لیکن اس سِکّے کا دوسرا چہرہ

بھی تھا۔ میں کلچرل اکادمی کا سیکرٹری تھا۔ اکادمی اُن دنوں ٹھیکے اور پرمٹ دینے کے سامان نہیں رکھتی تھی اور نہ کوئی تسلی بخش رقم۔ لیکن اُس دور کے ادیب بھی تو چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوش ہو جاتے۔ کسی کا کلام چھاپ دیا۔ کسی کے متعلق رسالے میں کچھ میٹھا میٹھا سا لکھا۔ کسی کو اُن دنوں کا قاعدہ توڑ کر باری آنے سے پہلے ہی مشاعرہ پڑھا دیا۔ کسی سے کسی نشست کی صدارت کرا لی تو وہ بہل جاتے تھے اور پھر شکریہ کرنے کے موقعے ڈھونڈنے لگتے تھے۔ لیکن میں پوری دیانت داری سے کہنا چاہتا ہوں کہ میرے خاصے لمبے زمانہ اختیار میں میکش کاشمیری نے ایک بار بھی مجھ سے کوئی چیز نہیں مانگی اور نہ کوئی فرمائش کی۔ سچّی بات تو یہ ہے کہ وہ میرے کمرے میں صرف ۲۸ جنوری کے مشاعرے کے سلسلے میں ایک آدھ بار آتے تھے۔ جب میں شمولیت کرنے والے شاعر حضرات کو چائے کی رُوکھی پیالی اور کچھ سلام کلام کیلئے باقاعدہ بُلاتا تھا۔ میکش صاحب کی طبیعت بہت لاابالی تھی۔ وہ کبھی کبھی برسوں شعر گوئی سے کنارہ کرتے جس طرح کوئی تیاگی اچانک سمادھی میں بیٹھ جاتا ہے۔ کبھی کبھی کہتے کہ انہوں نے شعر کہنا ترک کر دیئے ہیں لیکن پھر اچانک ان کی زبان کا جھرنا جاری ہوتا اور اشعار کے سوتے بہنے لگتے۔ لیکن یہ بات مجھے ہمیشہ حیرت زدہ کرتی رہی کہ انہوں نے اپنے بہترین زمانے میں اشعار کی اشاعت کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہاں تک کہ اِس دَور کے رسالوں میں بھی ان کی قلمی کاوشیں بہت شاذ ملتی ہیں۔ لیکن اَپنے آخری برسوں میں اُنہوں نے اپنا ضخیم شعری مجموعہ شائع کیا اور میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ بھی شائد اپنے بال بچوں کے اصرار کا مقابلہ کرنے کی طاقت سے محروم ہونے کے بعد خود سپردگی کی سی اَدا کے ساتھ۔ لیکن اسمیں شک نہیں کہ وہ پچاس سال سے زیادہ تک خاص طور جموں میں

اردو کے ایک ممتاز سخن گو اور اُردو سرائی کے علمبر دار رہے۔ انہوں نے کسی کے خلاف سازشیں نہیں کیں کہ وہ اس مٹی کے بنے ہوئے نہیں تھے۔ اور نہ manipulation سے اپنے حلقہ دار اور خریدار بنائے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اتنے اہم اُردو سرا اور مشاعروں کی رونق شاعر کی موت پر انہیں علمی اداروں نے نظر انداز کر دیا۔ یونیورسٹی میں نا شاعروں اور فیشنی ادیبوں مگر دولت اور طاقت والوں پر خود شیخ الجماعہ کی صدارت میں سمینار ہونے میں کوئی ننگ یا قباحت دیکھی نہیں جاتی لیکن میکش کاشمیری جیسے پُرخلوص اور جینون اَدبی شخصیت کو وہاں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ علامہ اقبال کبھی کبھی پتے کی بات کہہ جاتے ہیں۔

ہوئی نہ عام جہاں میں کبھی حکومتِ عشق

سبب یہ ہے کہ محبت زمانہ ساز نہیں

میکش کاشمیری ایک بہت اچھے استاد تھے اور ٹیوشن اُن کا خاص دائرۂ مہارت تھا۔ ان کے طلباء ان کی استادانہ دردمندی اور ہنری پر عش عش کرتے رہتے تھے۔ ان کی شخصیت کا یہ پہلو ان کی گہرائی کا سراغ دیتا تھا۔ بظاہر یہ بھولا بھالا سجن کس طرح علم وَدانش کا سفینہ رَواں رکھتا تھا۔

آخر پر میں ایک واقعے کا ذکر تھوڑے سے تامل کے باوجود کروں گا۔ تامل اس لئے کہ اسکا تعلق میری بے ہنر ذات سے ہے۔ لیکن ان کی ایک خاص خوبی کا اظہار اس کی مثال سے ہی سامنے آئیگا۔ کلچرل اکادمی میں ہم عصر ادیبوں وغیرہ کے ساتھ Meet the Eminent Contemporary میری زمانہ معتمدی میں ہی شروع ہوا تھا۔ اس کی کتابیں وغیرہ آراستہ کی جاتی ہیں، اس پر کچھ مقالہ نگار مدحیہ مضمون پڑھتے ہیں اور پھر اس سے سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ اس تقریب کی خاص بات

اسکا دیدہ زیب رنگین دعوتی کارڈ ہوتا ہے۔ اپریل ۱۹۹۹ء میں اکادمی والوں کی مجھ پر نظر پڑی۔ میں دل کے دَورے سے بال بال بچ کر زندہ رہا تھا۔ بہرحال مقررہ دن اور وقت پر جموں کے ابھینو تھیٹر ہال میں یہ تقریب ہوئی (میں ان دنوں وہیں پر مقیم تھا)۔ پروگرام چل رہا تھا کہ اچانک میکشؔ صاحب بِن بلائے ڈائس پر ایستادہ ہوگئے، جیسے نلکے میں سوراخ ہوکر اسکا پانی پورے زور سے اچھل رہا ہو۔ اُن کے ہاتھ میں ایک آراستہ پیراستہ شیشے کا فریم تھا۔ پروگرام کا انتظام کرنے والے تھوڑا سا سٹپٹائے کہ میں نے دشمنوں اور بیریوں کی بڑی فصل کاشت کی تھی۔ کیا خبر...... اور پھر ایسے پروگراموں میں انحراف کی گنجائش بھی نہیں ہوتی۔ میکشؔ صاحب اصرار کرنے لگے کہ ان کو اس فریم میں لگے ہوئے کاغذ سے پڑھنے کیلئے موقعہ دیا جائے۔ انتظام کرنے والے شش و پنج میں تھے کہ میں نے ان سے استدعا کی کہ میکش صاحب کو اُن کی سی کرنے کا موقعہ دیا جائے۔ چونکہ میں محفل کا دُلہا تھا لہٰذا انہیں سفارش مسترد کرنے سے گریز ہوا اور میکشؔ صاحب شروع ہوگئے۔ یہ اس بے بضاعۃ آدمی کی شان میں مدحیہ نظم تھی۔ ذائقہ چکھنے کیلئے ایک دُو اَشعار دینا لازمی معلوم ہوتا ہے۔

تیری اس کلکِ گُہر بار پہ قرباں خواجہ
جس سے نکلے ہیں کئی گوہر تاباں خواجہ
تیری ہر سطر ہے یا لولوئے لالہ کی لڑی
تیرا ہر لفظ ہے یا لعلِ بدخشاں خواجہ

میں اس موسلا دھار بارش میں پسینے پسینے ہو رہا تھا انہیں کسی نے بُلایا نہ تھا اور نہ کسی کو اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ کیا پڑھیں گے۔ انہیں دعوتی کارڈ ملا تھا تو

انہوں نے سب سے الگ ہو کے یہ اہتمام کیا تھا۔ بہرحال نظم ختم ہوئی تو وہ فریم لے کے میرے سامنے کھڑے ہو گئے۔ میں اٹھا تو اس نے یہ فریم میرے سپرد کر کے مجھے گلے لگایا اور وہ پھر اچانک غائب ہو گئے۔ دوسرے مقالہ نگار وغیرہ کی تواضع معمولی سے معاوضے سے بھی ہوئی مگر میکش صاحب نے نظر گھما کے بھی نہیں دیکھا۔ اس کے بعد وہ مجھ سے صرف ایک بار ملے جب ان کا مجموعہ 'بالِ ہما' چھپا وہ کتاب لے کر از راہِ عنایت میرے غریب خانے پر آئے اور میرے ساتھ کچھ ساعتیں بسر کیں۔ پھر ممبئی سے ان کے چلے جانے کی خبر آئی تو میں واقعی دلِ ستم زدہ کو تھام تھام کے رہ گیا۔ میر تقی میر کا ایک شعر پھر نوکِ قلم پر آ گیا ہے۔

حیران ہے لحظہ لحظہ طرزِ عجب عجب کا
جو رفتہ محبت واقف ہے اس کے ڈھب کا

☆

زبیر آباد

سنجون روڈ، نروال جموں

عزیزی اشرف صاحب!

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ ریاست کے معروف شاعر میکشؔ کاشمیری کے بارے میں شیرازہ میں گوشہ مرتب کر رہے ہیں اور مرحوم کے بارے میں میری چند سطریں بھی اِس میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔

میکشؔ کاشمیری کی رحلت کی خبر سنی تو ایک گہرے رنج اور زیاں کا احساس ہوا۔ مرحوم نے پوری زندگی فکرِ معاش اور فکرِ شعر میں گزاری اور جلبِ زر اور حصولِ شہرت سے دُور رہے۔ یوں تو ہر قلمکار کی موت کم وبیش اِسی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو انگیز کرتی ہے، تاہم مرحوم کے بارے میں یہ کیفیت دیر تک میرے دل ودماغ پر حاوی رہی۔ مرحوم سے میری چند ملاقاتیں ہی ہوئی تھیں۔ اُن کو ریاستی سطح پر منعقدہ مشاعروں میں دیکھا تھا۔ گویا اُن سے شناسائی سلام ودُعا سے آگے نہ بڑھی تھی پھر بھی میں ان کی سیدھی سادھی دَرویشانہ وضع قطع، اُن کے انفرادی لب ولہجہ اور ان کی منکسر المزاجی سے متاثر تھا۔

۱۹۷۶ء میں سری نگر کی برفیلی سردی سے بچنے کیلئے میں اپنی پوری فیملی کے ساتھ جموں منتقل ہوا۔ میرے عزیز حکیم منظور نے ہمیں محلہ اُستاداں میں دو کمروں

پر مشتمل سیٹ کرایہ پر دیا۔ ایک مہینہ گزر گیا۔ میں اُپنی عادت کے مطابق اُپنے گھر والوں کے ساتھ وقت گزارتا رہا اور اُدبی مجالس سے دُور رہا۔

ایک دن صبح کو میکشؔ کاشمیری صحن میں نمودار ہوئے اور پورے آداب واخلاق کے ساتھ میرے وارد جموں ہونے پر خوشی کا اظہار کیا۔ ہم کچھ دیر بیٹھے رہے۔ میں نے ان کا غریب خانے پر آنے کا شکریہ اُدا کیا۔ فوراً بعد انہوں نے ریڈیو جموں کا کنٹریکٹ فارم میرے ہاتھ میں دیا اور کہا کہ وہ میرے کلام کو ریڈیو کیلئے ریکارڑ کرانا چاہتے ہیں۔ یہ بات انہوں نے اِتنے اعتماد، شفقت اور اپنائیت سے کہی کہ مجھ سے اِنکار بن نہ پڑا۔ مجھے خوشی بھی ہوئی کہ وہ میری شاعری کو کسی لائق تو سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ دو تین بار آئے اور مجھے اُپنے ساتھ سٹیڈیو لے گئے اور اُپنی نگرانی میں میری غزلیں ریکارڑ کروائیں۔ اِس پورے پروسیس میں میکشؔ کاشمیری جو غالباً عمر میں اور شعر و شاعری میں یقیناً مجھ سے سینئر تھے، کا انکسار، احترام اور خلوص دیدنی تھا۔ میں حیرت سے انکو دیکھتا رہا۔ میں شرمندگی بھی محسوس کرتا رہا۔ ایک تو انہوں نے مجھے ڈھونڈ نکالا اور پھر ریکارڈنگ ہونے تک اتنی زحمت برداشت کی کہ عام طور پر کوئی کسی کیلئے نہیں کرتا۔ اِس ملاقات کے بعد میں اِن سے مل نہ سکا۔ تاہم اس ملاقات کا نقش میرے دل پر ثبت ہے۔

اُن کی غزلیں گاہے گاہے ریاست کے اُردو جرائد میں نظر آتی تھیں اور میں ان کے کلام کے بارے میں یہ تاثر قائم کر چکا تھا کہ وہ روائتی انداز میں مگر پوری اُستادانہ مہارت سے گرد و پیش کے بدلتے حالات کے تحت انسانی فکر و خیال کو اُشعار میں ڈھالتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے معاصرین یعنی کشن سمیلؔ پوری، عشرتؔ کاشمیری، رساؔ جاودانی، شہؔ زور، طالبؔ، نازکیؔ اور قیصر قلندرؔ کی صفوں میں جگہ

پا چکے ہیں۔ وہ ایک ذکی الحس انسان کی طرح سیاست کے ہتھکنڈوں ، سماجی تفادات، حسن وعشق اور ذاتی دکھ درد کی کیفیات کی تجسیم کرتے رہے۔

یہ موقع نہیں کہ میں ان کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالوں، تاہم یہ کہنا چاہوں گا کہ میکش کاشمیری اپنے دَور کے بیدار مغز اور انسان دوست شخص تھے۔ جیسا کہ ان کے کلام سے بھی ظاہر ہوتا ہے، ایسے اشخاص روز روز پیدا نہیں ہوتے اور جب ایسا کوئی شخص پیدا ہوتا ہے تو اقدار کش سماج میں انسانیت کی احیاء ہوتی ہے۔ حالانکہ وقت کے اربابِ اقتدار ایسے لوگوں کو آسانی سے نظر انداز کرتے ہیں، اور نادانستہ طور پر اپنا اور اپنے ملک کا زیاں کرتے ہیں، میکش کاشمیری صاحبِ فکر شاعر تھے، انہوں نے تنگ دستی کی تاریکی کے باوجود اپنے اَشعار کی تابانی ماند نہ پڑنے دی۔ یاد رہے کہ ایسے برگذیدہ نفوس عالمگیر سطح پر اور باتوں کے علاوہ ہوش رُبا کائناتی اسراریت اور انسان کی عدمیت کے چیلنج کو قبول کرتے ہیں اور شعوری یا غیر شعوری طور پر تخلیقی قوت سے اس کا سامنا کرتے ہیں۔ غالب کا یہ کہنا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل یار رہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عدمیت سے یہ مزاحمتی تصادم اس کی 'آہ آتشیں' سے بھی ممکن الوقوع ہوسکتا ہے، بدقسمتی یہ ہے کہ لوگ ان 'خرقہ پوشوں' کو پہچاننے کی سعی نہیں کرتے۔

بہر حال آپ نے اَپنے محدود وسائل کے باوجود میکش کاشمیری کا گوشہ مرّتب کرنے کا بیڑا اٹھانے کا قابلِ قدر اقدام کیا ہے۔ مگر کیا یہ کافی ہے؟ کیا انکے کلام (مطبوعہ وغیر مطبوعہ) اور دیگر باقیات کو آئندہ نسلوں کیلئے محفوظ کرنے کی ضرورت نہیں؟ آپ نے پڑھا ہوگا کہ اُردو کے اولین فکشن نگار آنجہانی پریم چند

کے اُجڑے گھر میں آوارہ کتے رہتے ہیں۔ ہم نے بھی اِدھر اپنے رفتگاں ناز کی، شہ زَور، علی محمد لون، اختر محی الدین، میرزا عارفؔ، نشاطؔ انصاری، موہن یاَور اور ٹھاکر پونچھی وغیرہ کیلئے کیا کیا ہے؟ اِس کسمپرسی اور خود غرضی کے دور میں آپ اپنی ریاست کے مشاہیر کے بارے میں گوشے مرتب کر کے قابل ستائش کام کر رہے ہیں، امید ہے میکش کاشمیری کا گوشہ ہر لحاظ سے جاذبِ نظر ہوگا۔ والسلام

آپ کا
حامدؔی کاشمیری

قارئین سے گذارش

...... "شیرازہ" کے بارے میں اپنی رائے بطور خاص مرحمت فرمایئے اور اپنے مشوروں سے ہمیں نوازتے رہیے۔

...... شیرازہ کو اپنے دوستوں سے متعارف کرایئے اور خریداری کیلئے توجہ دلا کر اسے زیادہ سے زیادہ ادب نوازوں تک پہنچانے کی کوشش میں ہمارا ساتھ دیجیے

☆

میکشؔ کاشمیری

ہمہ جہت شخصیت، فن

ہر کسبِ ہنر کے لئے درکار ہے اِک عُمر
برسوں کی ریاضت ہی سے پیدا ہیں ہنر مند
(میکشؔ)

اپنے اوّلین مجموعۂ کلام ''بالِ ہُما'' کے بعد اُردو ادب کے دامن میں ''بالِ عنقا'' کے عنوان سے ایک اور فن پارے کا اِضافہ کرنے والے کہنہ مشق سخن سنج پنڈت کیلاش ناتھ کول میکشؔ کاشمیری کا تعلق ریاست جموں و کشمیر کے ایک معزز اور عِلمی و ادبی خانوادے سے ہے۔ اُن کے والد آنجہانی پنڈت جیون ناتھ کول محکمہ سیری کلچر میں ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ موصوف سات سال تک یورپ کے ممالک میں رہے۔ اُنھیں ہندی، اُردو، فارسی، سنسکرت اور انگریزی کے علاوہ فرنچ پر بھی عبور حاصل تھا۔ اُنھیں کُتب بینی کا والہانہ شوق تھا اور اُن کی خرید پر زرِ کثیر صرف کرتے تھے۔ اُن کا بیشتر وقت رُوحانی کُتب کے مطالعے میں گزرتا۔ مولانا رومؔ، شمس تبریزؔ، شیخ سعدیؔ، حافظ خواجہ فریدالدین عطّار اور علاّمہ اِقبال اُن کے محبوب شعرا

تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صغر سنی ہی میں میکشؔ کاشمیری کو علامہ اقبال کی بانگِ درا، بالِ جبرئیل، ضربِ کلیم اور پیامِ مشرق کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ میکشؔ کے برادرِ اصغر پنڈت گیان ناتھ کول، جو ایک عرصے تک میڈیکل سروسز سے وابستہ رہے، کی شخصیت ہمیشہ ایک ادب نواز اور ادب شناس کی سی رہی اور یہ وصف اُن کی ذات میں آج بھی موجود ہے۔ اُن کے برادرِ اکبر پنڈت مہندر ناتھ کول بھی ادبی صلاحیتوں کے مالک ہیں اور اُن کے منتخبہ اقوالِ زرّیں، علمی و ادبی مراسلے اور تحقیقی و تاثراتی مضامین اکثر اخبارات اور رسائل و جرائد میں چھپتے رہتے ہیں۔ گویا اِیں خانہ ہمہ آفتاب است۔ میکشؔ کاشمیری بچپن ہی سے شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے اور ذوقِ خُداداد کے سہارے اُنھوں نے مشقِ سخن طرازی کا سلسلہ جاری رکھا۔ اُن کے ادبی ذوق کی نشو و نما میں جہاں اُن کے اساتذہ مولانا سلام شاہ (مرحوم) اور پنڈت وِشوا ناتھ درماہ جموی کی تربیت کا خاصا دخل رہا وہیں میکشؔ کے رفقاء قیسؔ شیروانی نظامی گنجوی، کیفؔ اسرائیلی، حبیب کیفویؔ، لاغرؔ جموی، لالہ منوہر لال دِلؔ، کشمیری لال ذاکرؔ، منگو رام وفاؔ، اللہ رکھا ساغرؔ، عبدالسمیع پال اثرؔ صہبائی، دیا نند کپور اور عشرتؔ کشتواڑی کی صحبتوں نے بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ اِس ضمن میں دریائے توی کے مغربی کنارے پر واقع صوفی سنتوں کی سرزمین جموں کی علمی و ادبی فضا کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جس نے ہر دَور میں نئے لکھنے والوں کے ذوقِ سلیم کو پروان چڑھانے کے لیے ایک سازگار ماحول فراہم کیا۔ داغؔ اسکول کے قد آور مسلم الثبوت اُستاد شاعر ابوالفصاحت جوشؔ ملسیانی کی سرپرستی نے اُن کے شوق کے لیے مہمیز کا کام کیا اور آج صورتِ حال یہ ہے کہ میکشؔ کاشمیری ریاست کے سر برآوردہ شعرائ کی صف میں کھڑے نئی نسل کی ہدایت و اصلاح میں مُنہمک نظر آ رہے ہیں۔ یہ اُن کا بڑا پن ہے

کہ وہ خود کو ابھی تک طفلِ مکتب ہی سمجھتے ہیں۔ آج کل آپ پونہ یونی ورسٹی کے سابق صدر شعبہء اُردو اور فارسی، مشہور و معروف ادیب اور ممتاز شاعر ڈاکٹر امانت شیخ سے گاہے ماہے مشورۂ سخن حاصل کرتے رہتے ہیں اور خود کو اُن کی خاکِ پا سمجھنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

میکشؔ کاشمیری کی ادبی زِندگی کا آغاز تقسیمِ وطن سے قبل ہوا۔ اُن کے معاصرین میں سے بیشتر کے اَب تک کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن اس تہتر سالہ بزرگ شاعر کا اوّلیں شعری مجموعہ "بالِ ہُما" ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا۔ نِصف صدی پر محیط اُن کے ادبی سفر کے نتیجے میں صرف ایک شعری مجموعے کا زیورِ طبع سے آراستہ ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اُنھیں کسی قسم کی مالی دُشواری کا سامنا تھا یا یہ کہ "بقامت کہتر بقیمت بہتر" کا اُصول اُن کے پیشِ نظر رہا ہو اور وہ مہینوں کے غور و فکر کے بعد ایک آدھ غزل یا نظم کہہ رہے ہوں۔ ایسا کچھ بھی نہیں تھا.......... اللہ کے فضل و کرم سے اُن کا تعلق ایسے خاندان سے ہے جہاں مال و زَر کی فراوانی کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔ میکشؔ صاحب از خود بھی تیس پینتیس برس تک ریڈیو کشمیر جموں اور سری نگر سے وابستہ رہے اور ریڈیو سے سُبکدوش ہونے کے بعد جموں کے ایک معیاری تعلیمی ادارے "دیوان بدری ناتھ وِدّیا مندر" میں انگریزی کے لیکچرر رہے۔

اِن حالات میں مالی وسائل کی کمیابی یا نایابی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پرورشِ لوح و قلم کے حوالے سے عرض کرتا چلوں کہ میکشؔ نے اپنی ادبی زِندگی کے آغاز ہی سے کثرت سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ مشاعروں میں جس قدر جوش و خروش اور رَواں لب و لہجے میں وہ اپنا کلام پڑھتے، اُسی رَوانی سے اُن پر شعروں کا نزول بھی ہوتا۔ مَیں نے اپنے لڑکپن کے ایّام میں صنعتی نمائش جموں میں منعقد ہونے والے

مشاعروں، ریڈیو اور کلچرل اکادمی کے مشاعروں اور محلّہ دلپتیاں میں واقع حکیم منظور کے دولت کدے پر سجنے والی شعری محفلوں میں میکشؔ کو فی البدیہہ اشعار کہتے ہوئے سُنا ہے۔ اگر آمد اور نزول کا یہ سِلسِلہ بدستور جاری رہتا تو یقیناً اب تک اُن کے نصف درجن سے زائد مجموعہ ہائے کلام چھَپ چکے ہوتے، لیکن علّامہ اِقبال، جنھیں میکشؔ اپنا رُوحانی مُرشد اور معنوی اُستاد تسلیم کرتے ہیں، کے کلام نے اُن پر ایسی کیفیت طاری کردی کہ اُنھوں نے شعر گوئی ترک کردی اور سوامی کیلاش نندا بن کر مراقبے میں چلے گئے اُنھوں نے شاعری کو پیغمبری سمجھ لیا اور خود کو گنہگار مجذوبی و مستی کے زیرِ اثر اپنا تمام شعری و نثری سرمایا، جس پر کبھی اُنھیں ناز تھا، تلف کر ڈالا اور سخن طراز دوستوں اور ادیبوں سے قطع تعلّق کر کے یکسر گوشہ نشینی اِختیار کرلی۔ اِس سلسلے میں از خود لکھتے ہیں:

”....... جب میں نے شاعرِ مشرق و دانائے راز علّامہ اِقبالؒ کے کلام کا عمیق مُطالعہ کیا اور اس کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کی تو مجھے اِس اَمر کا شدید احساس ہوا اور عرفان بھی کہ

ع - شاعری جزویست از پیغمبری،

نتیجہ یہ ہُوا کہ میں نے شعر و شاعری ترک کرنے کی ٹھان لی اور برسوں تک مِنقار زیرِ پر رہا۔ چُوں کہ رُوحانیت سے رغبت بدرجہ اَتم ہے اور طبعاً و عملاً عُزلت پسند واقع ہوا ہوں۔ میں نے زِندگی کی باقی آلائشوں کی طرح شعر و شاعری کو بھی تلانجلی دے دی........“[۲]

شاعری کو 'جُزوِ پیغمبری'' سمجھ لینا میرے خیال میں مناسب نہیں ہے۔ مصرع دیکھیں کہ .... 'شاعری جزوے است از پیغمبری' یعنی شاعری پیغمبری کا ایک چھوٹا سا جزو ہے۔ جب شاعری کو پیغمبری سمجھ لیا جائے تو اُس کیفیت سے دو چار ہونا قدرتی اَمر ہے جس کیفیت سے میکشؔ دوچار ہوئے اور شاعری کا سلسلہ چھوڑ کر مجذُوب ہو گئے یا مجذُوبی کے عالم میں شاعری چھوڑ دی۔

اِس سلسلے میں ایک بار مَیں نے پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ، جن کی صحبت سے مَیں نے خوب فیض اُٹھایا ہے' سے دریافت کیا کہ کیا شاعری واقعتاً جُزوِ پیغمبری ہے......؟ اُنھوں نے کہا کہ شاعری کُلّیتہً جُزوِ پیغمبری نہیں ہے بلکہ اِسے پیغمبری کا ایک ہلکا سا جزو قرار دیا گیا ہے۔ پھر موصوف نے علّامہ اِقبال کا یہ شعر سُناتے ہوئے

کرم شب تاب است شاعر در شبستانِ وجود
در پَروبالش فروغے گاہ ہست و گاہ نیست

کہا کہ اِس شعر میں علّامہ نے اِس اَمر کو بڑے مؤثر انداز میں واضح کر دیا ہے۔ اگر 'گاہ نیست' کا صحیح مفہوم سمجھ میں آجائے تو مزید وضاحت کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

بہرکیف، کم وبیش دو دہائیوں تک گم نامی کی زِندگی جینے کے بعد میکشؔ کاشمیری خدمتِ زبان و ادب کے لیے پھر سے کمربستہ ہوئے اور ایک مختصر سے عرصے میں اِس قدر شعر کہے کہ ''بالِ ہُما'' معرضِ وجود میں آ گئی۔ موصوف اِس بارے میں لکھتے ہیں:

''......قارئین کرام! آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ اِس شعری مجموعہ (بالِ ھُما) میں شامل سارا

کلام میں نے کُل چار مہینوں کی مُدّت کے دوران کہا
ہے۔ پہلی بیاضِ شعر جس پر قبلہ ابوالفصاحت حضرت
جوشؔ ملسیانی صاحب نے اِصلاح فرمائی تھی، مستی
کے عالم میں تلف کر دی تھی......... ''[۳]

میکشؔ کاشمیری نے اگر چہ مستی کے عالم میں اَز خود ہی اپنے ادبی سرمائے کو پہلے چاک چاک اور پھر نذرِ آتش کر دیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُنھیں اپنے ادبی سرمائے کے لُٹ جانے یا خود ہی لُٹا دینے کا اَز حد رنج رہا۔ اِس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ آج اگر اُن کی کوئی پُرانی تخلیق اُن کے سامنے آجائے تو اُن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔ اِس حقیقت کا اِنکشاف مجھ پر تب ہُوا جب مَیں نے ہفت روزہ ''آرٹ اینڈ لٹریچر''[۴] کے شمارہ ۱۱، مورخہ ۵/دسمبر ۱۹۹۸ء میں اُن کی ایک پُرانی نظم ''سالارِ وطن'' شائع کی۔ یہ نظم میرے ذاتی کُتب خانے میں کیسے محفوظ رہی یا کیسے پہنچی، یہ مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔ ممکن ہے میرے والد الحاج عبدالقیوم قریشی قادری صاحب (مرحوم و مغفور) نے مجھے عنایت کی ہو۔[۵] بہر طور، جب ''آرٹ اینڈ لٹریچر'' کا مذکورہ شمارہ میکشؔ کو مِلا تو اُنھوں نے مجھے ایک خط لکھا جس کا ایک ایک لفظ فرطِ مسرّت میں ڈُوبا ہوا تھا۔ مکتوب ہٰذا کا ایک اِقتباس پیش ہے تا کہ پڑھنے والے اِس بات کا بخوبی اندازہ کر سکیں کہ اپنی شاعری کے پہلے دَور کی تخلیقات سے اُنھیں کس قدر لگاؤ رہا اور پرانی یادیں اُنھیں کس قدر بے چین و بے قرار کر دیتی ہیں:

''......... جائے حیرت ہے کہ بابائے قوم شیرِ کشمیر
(شیخ محمد عبداللہ) کی شان میں کبھی جو مَیں نے
''سالارِ وطن'' کے عنوان سے چند شعر کہے تھے، آپ
کو کہاں سے دستیاب ہُوئے؟ مَیں نے اپنے اِس

محبوب نیتا پر کئی نظمیں کبھی حوالہء قلم کی تھیں، محض اِس
لیے کہ شیخ صاحب کے تیئں میرے دِل میں عقیدت
واحترام پرستش کی حد تک ہے۔ جب مَیں ریڈیو کشمیر
سری نگر میں تعینات تھا تو مَیں اکثر اُن کی کوٹھی پر مادرِ
مہربان بیگم عبداللہ صاحبہ کی تلاوتِ قرآن شریف کی
ریکارڈنگ کی غرض سے جایا کرتا تھا
افسوس اِس بات کا ہے کہ میرے پاس ایسی نظموں کا
کوئی ریکارڈ موجود نہیں ۔ البتہ ایک نظم خواجہ
صدرالدّین مجاہد (میرے مہربان اور رفیقِ خاص)
کے پاس موجود تھی اور دو نظمیں خُلد آشیانی مولانا محمد
سعید مسعودی صاحب لے گئے تھے۔ میں نے اُن
جیسا کوئی مقرّر آج تک نہیں دیکھا۔ وہ بڑے عالم
اور فاضل تھے اور نہایت ہی شُستہ و برجستہ اُردو
زبان میں گلباریاں کیا کرتے تھے۔ آہ ——— !
اُنھیں بھی ہم سے چھین لیا ایک بار مُلک کے
مشہور انڈسٹریلسٹ دلال صاحب کی گندہ بروزہ کی
فیکٹری کا بڑی براہمناں میں اِنعقاد تھا۔ اُس تقریب
میں جب مَیں نے بابائے قوم شیرِ کشمیر کی شان میں
ایک شاندار اور معرکتہء الآرا نظم، جو آٹھ بندوں
پر مشتمل تھی، پڑھ کر سُنائی تو قبلہ و کعبہ شیخ صاحب اِس
درجہ مسرُور ہوئے کہ اُنھوں نے اِختتامِ تقریب پر
مولسری کے پھولوں والا بھاری بھرکم ہار، جو غالباً
دلال صاحب نے بنگلور سے خاص طور پر آرڈر دے

کر منگوایا تھا' اپنے مصاحب کے ہاتھ مجھے بھیجا اور
اُسے تاکید کی کہ وہ مجھے پہنائے۔ وہ چھوٹے قد کا ہم
وطن کشمیری بھائی ہی تھا۔ نام تو اَب یاد نہیں آرہا
غالباً اُس کا وصال ہو چکا ہے۔ یہ زمانہ صدر جمہوریہ
نیلم سنجیوا ریڈی کا تھا۔ اُس تقریب میں عمائدینِ شہر
کے علاوہ شری وید بھسین بھی موجود تھے
خیر مجھے ایک مختصر سی نظم جو طاقِ نسیاں ہو چکی تھی آپ
کی وساطت سے مِل گئی ہے' اِسے ازسرِ نو لکھوں
گا.........'' ؎

اپنے ہم وطن اور ہم زبان' رُوحانی مُرشد اور معنوی اُستاد علاّمہ اِقبال کے
عِشق میں از خود رفتگی کا شکار ہو کر اپنا سب کچھ قربان کر دینے اور فکرِ اقبال کو حرزِ جاں
بنانے والے میکشؔ کاشمیری اِبتدا ہی سے علاّمہ اقباؔل سے متاثر تھے۔ اپنے ایک
مراسلے میں لکھتے ہیں:

''.......میرے پاس میرے رُوحانی مُرشد کی کوئی
کتاب موجود نہیں ہے' البتہ صغرسنی کے زمانے
میں ''پیامِ مشرق''، ''بانگِ درا''، ''بالِ جبرئیل''
اور ''ضربِ کلیم'' کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ ''اسرارِ خودی''
اور ''رموزِ بیخودی'' کا نہیں۔ البتہ ''مثنوی مولانا روم''
ضرور پڑھی ہے اور وہ بھی جستہ جستہ۔ اس مطالعہ نے تو
میری جیون دھارا ہی بدل دی۔ اگرچہ کشمیری نژاد
برہمن (ہندو) ہوں مگر نصف مسلمان بھی ہوں...... ؎

میکشؔ کاشمیری نے سخن گوئی کے کئی مراحل پر علاّمہ اِقبال کے اثر کو قبول کیا

ہے اور اُن کا لب ولہجہ اِختیار کرنے کی کوشش بھی۔ ''بالِ ہُما'' میں اِس کی کئی مثالیں موجود ہیں لیکن ''بالِ عنقا'' کی غزلوں کے مطالعے سے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے علاّمہ کی رُوح اُن میں منتقل ہوگئی ہو۔ ''بالِ عنقا'' کا سارا کلام اِقبال کی زمینوں میں کہا گیا ہے اور کلام میں اِقبال کے فکروفن کے اثرات واضح طور پر نمایاں ہیں۔ اپنے ایک مکتوب میں اِس بات کا اعتراف میکشؔ نے یوں کیا ہے:

> ''........ بنجارا صاحب میرے رُوحانی مُرشد اور معنوی اُستاد علاّمہ اقبالؒ بھی حضرت داغؔ کے حلقہء تلامذہ میں شامل تھے اور مَیں بھی اپنے اُستادِ محترم قبلہ ابوالفصاحت حضرت جوشؔ ملسیانی صاحب کی بدولت اِسی خاندان سے مُنسلک ہوں۔ پہلے میں بھی ایسی شاعری کو ترجیح دیتا تھا مگر علاّمہ اقبالؒ کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد اَب کسی حد تک موصوف کے رنگ و آہنگ کو اپنانے کی کوشش جاری رکھے ہُوئے ہوں۔ یہ رنگ و آہنگ آپ کو ''بالِ عنقا'' میں شاید نظر آئے گا۔ ہفتہ عشرہ کے بعد پائیلٹ پین سے بڑھیا سفید کاغذ پر تمام غزلیں فیئر کرنا شروع کردوں گا۔۔۔ زوریکس کاپیاں تیار ہوجائیں تو اِنشا اللہ اِس فوٹو اسٹیٹ مسوّدے کی ایک کاپی خدمتِ اقدس میں ارسال کروں گا......''[6]

مذکورہ بالا مراسلے کے چندروز بعد میکشؔ کے دُوسرے شعری مجموعے ''بالِ عنقا'' کا مسوّدہ مجھے ملا۔ شاعرِ مشرق علاّمہ اِقبال کی زمینوں میں کہی ہُوئی اِن

غزلوں میں سادگی و سلاست بھی ہے اور اثر آفرینی بھی۔ بیان کا لطف اور اسلوب کی خوبیاں واضح طور پر نمایاں ہے۔ کلاسیکی اقدار کے علم بردار میکشؔ کاشمیری نے غزل کی روایات کی پابندی کرتے ہوئے اپنی قلندری اور اِستغنائی کے جلوے بھی جابجا بکھیرے ہیں۔ چوں کہ مجھے ابھی کچھ اور بھی کہنا ہے اِس لیے یہاں ''بالِ عنقا'' کے چند اشعار پیش کرنے پر ہی اِکتفا کرنا مناسب رہے گا۔

ہیں اہلِ جنوں محرم اسرارِ حقیقی
نادان نظر آتے ہیں جتنے ہیں خِردمند

اِبتلاؑ و کربِ پیہم، اضطرابِ جاں گسل
مختصر سی بس یہی ہے داستانِ اہلِ درد

یہ ارض و سما ذات میں موجود ہیں تیری
یوں دیکھ نہ ہر سمت، ذرا خود پہ نظر کر

جنتِ کشمیر کو کِس کی نظر یہ کھا گئی؟
غمزدہ سے ہیں شکارے اور ہے خاموش جھیل

ماہ پر ڈال لی آدم نے کمند. اپنی مگر
سُوئے خُورشید مگر کوئی سفر کر نہ سکا

تیرے نصیب میں یہ وُسعتیں فلک کی کہاں؟
اُڑان تیری اگر مثلِ شاہباز نہیں

جِن کو رُوحانی لگن تھی، جِن کے قابو میں تھے مَن
اَب کہاں وہ شیخ و زاہد، اب کہاں وہ برہمن؟

وہ نہ عرش پر ہے نہ فرش پر، نہ نشیب میں نہ فراز میں
کہیں اور اُسکو نہ ڈھونڈ تُو وہ ملے گا قلبِ گداز میں

یہ بات صحیح ہے کہ میکشؔ کاشمیری، علاّمہ اِقبال کے بے حد قریب ہیں لیکن اُنھوں نے دُوسرے اُستاد شعرا کا اثر بھی قبول کیا ہے اور اُن کے رنگ میں کامیاب غزلیں کہی ہیں۔ اثر و نفوذ کے ایسے مراحل ''بالِ ہُما'' میں دیکھے جاسکتے ہیں جو اِس بات پر دال ہیں کہ اُن کا مطالعہ کس قدر وسیع ہے لیکن علاّمہ کے بعد میکشؔ نے اُردو کے جس بڑے شاعر کے رنگ میں شعر کہنے کی سعی کی ہے، وہ مرزا غالبؔ ہیں۔ غالبؔ کی زمین میں کہی ہوئی میکشؔ کی ایک طویل غزل کے چند اشعار دیکھئے۔

جب سُنا، اَن سُنا کرے کوئی
کیا بیاں مُدعا کرے کوئی

یار رُوٹھے، کوئی منا بھی لے
بخت رُوٹھے تو کیا کرے کوئی

کوئی کمتر نہیں کسی سے بھی
ترک اپنی اَنا کرے کوئی

وُسعتِ آسماں کا اندازہ
دیکھ کر کیا خلا کرے کوئی

موت تو ہے نجات دہندہ
موت سے کیوں ڈرا کرے کوئی

وہ جو بے مانگے رِزق دیتا ہے
اُس سے کیا اِلتجا کرے کوئی

میرا تو خود خُدا ہے چارہ ساز
''ابن مریم ہُوا کرے کوئی''

صاف مَن ہی نہیں اگر میکشؔ
لاکھ مالا جَپا کرے کوئی

میکشؔ کاشمیری صرف ایک خوش فکر سخن سنج ہی نہیں بلکہ ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ نثر میں بھی اُنھوں نے کئی فکر انگیز اور معلوماتی مضامین قلم بند کئے ہیں۔ راقم الحرُوف کے نام مُرسل اُن کے خطوط کے جو اِقتباسات اِس مضمون میں نقل ہوئے

ہیں، یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ اُن کی نثر کِس قدر شُستہ اور رَواں ہے
تاہم اُن کی عمدہ نثر کے دو ایک اِقتباسات ذیل میں درج کر رہا ہوں جن میں اُن
کی محقّقانہ و ناقدانہ بصیرت تو اپنے عروج پر نظر آتی ہی ہے، ساتھ ہی اِس امر کا اِظہار
ہو بھی ہو جاتا ہے کہ غالبؔ کے تئیں اُن کے دِل میں کِس قدر عقیدت تھی:

”........مرزا کو رجائی یا قنوطی، کسی ایک طبقے سے
مُنسلک کرنا سراسر بے اِنصافی ہے، کیونکہ زِندگی سے
متعلق اُن کا کوئی مُعیّن فلسفہ نہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ
وہ وحدت الوجود کا نظریہ رکھتے تھے۔ وہ نہ تو محض رجائی
تھے اور نہ محض قنوطی۔ البتہ اُمید و یاس کے دوراہے پر
ضرور کھڑے نظر آتے ہیں۔ اُن کی طبیعت میں اِن دو
متضاد میلانات کا پایا جانا قدرتی بات تھی۔ آخر

ع۔ کشاکش ہے اُمید و یاس کی، یہ زندگی کیا ہے،

اور پھر اِس دُو گونہ افشانی کے بارے میں وہ خود بھی تو فرماتے ہیں کہ ؎

نالہ پابندِ نَے نہیں ہے　　　فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے

نوحہ ءغم ہو یا نغمہ ءشادی، مرزا کے کان ہر
دو آہنگ سے آشنا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر رنگ اور ہر
مزاج کا آدمی اُن کے کلام سے لُطف اندوز ہو سکتا
ہے۔ غالبؔ کا سارا دیوان کھنگال ڈالیے، کہیں آپ
کو پسپائی و نا اُمیدی ملے گی تو کہیں بُلند حوصلگی و
اُمید کی تابنا کی۔ انہی دو رنگوں سے اس نے سمن
زار کی فضا تیار ہوئی ہے۔ غرض ”دیوانِ غالبؔ“ یاس
انگیز و نشاط آفریں اشعار کا ایک مرقّع ہے۔ مرزا کی نظم

ونثر میں زِندگی کے دونوں پہلو نمایاں ملیں گے۔
حُزن وملال کا اِظہار بھی اور نشاط وسکونِ حیات کا
پیغام بھی........"
نثریاتِ میکش کا ایک اور نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

"........ اُردو شاعری میں غالبؔ کی اِنفرادیت
بلاشک مُسلّم ہے۔ وہ صرف اِس لیے عظیم نہیں کہ
اُنہوں نے ہمارے لیے بہت سے ادبی جواہر پارے
چھوڑے ہیں بلکہ اِس لیے کہ اُنہوں نے ہمیں ایک
نیا اسلوبِ فکر اور ایک نیا مسلکِ شاعری سکھایا۔
ع ۔ ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

مرزا نے اپنی گل افشانیءِ گفتار سے ہر چھوٹے بڑے کا دِل موہ لیا ہے۔ کیا نثر، کیا نظم، کیا اُردو، کیا فارسی، غالبؔ سب پر غالب ہیں۔ اُنہوں نے مخصوص انداز میں زِندگی کے مسائل اور رموزِ کائنات کو سمجھے اور سمجھانے کوشش کی ہے اور وہ بھی ایک ادائے خاص کے ساتھ۔

ادائے خاص سے غالبؔ ہُوا ہے نُکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نُکتہ داں کے لیے

اُن کے کلام کی سب سے بڑی خوبی اُن کا تفکُّر ہے۔
اُن کا سا فکر عالی ہر گز کہیں نہ ملے گا۔ اُنہوں نے
اپنے بعد آنے والی نسلوں کو ایک جدید رُجحان اور ترقی
پسند شعور عطا کیا ہے........"!!

مضمون کے آخیر میں اُس منسکر المزاج، مخلص اور نیک اِنسان کی ایک اور

خوبی کا ذِکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اُن کی یہ خوبی ہے اُردو زبان سے اُن کا والہانہ عشق اُردو کے تئیں اُن کی والہانہ عقیدت کا عالم یہ ہے کہ وہ اُردو کی ہر ایک ادبی انجمن سے وابستہ ہیں اور اُردو کے ہر رسالے و جریدے سے اُن کا تعلق خاطر قائم ہے۔ اُردو کا کوئی پرچہ اُن کے سامنے آیا نہیں کہ اُنھوں نے بذریعہ منی آرڈر زرِ تعاون روانہ کر دیا۔ اُردو کے نام پر کہیں بھی محفل سجا کر دیکھ لیجے، میکشؔ کاشمیری لاٹھی کا سہارا لیے ہوئے وہاں پہنچ جائیں گے، اگرچہ اُن کی قوتِ سماعت کمزور پڑ چکی ہے، ضعفِ بصارت عروج پر ہے اور ریڑھ کی ہڈی کا منکا ڈھل چکا ہے۔ اُردو صرف اُن کا اوڑھنا بچھونا ہی نہیں ہے بلکہ اُردو اُن کی رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے ؎

رُواں رُواں مِرا اُردو کا نام لیتا ہے
کہ میرا جسم بھی اُردو ہے، جان بھی اُردو

(بالِ عنقا)

اِسی میں ہوگی خُدا سے بھی گفتگو میکشؔ
کہ روزِ حشر بھی ہوگی مِری زباں اُردو

(بالِ عنقا)

میکشؔ کاشمیری صاحب، کشمیری النسل ہیں۔ عُمر کا زیادہ حصّہ اُنھوں نے جموں ہی میں گزارا اور ۔۔۔۔ مستقل طور پر جموں ہی میں مقیم رہے ہے۔ کشمیری اُن کی مادری زبان ہے اور ڈوگری پر بھی اُنھیں دسترس حاصل ہے۔ لیکن کیا مجال کہ درونِ خانہ کوئی کشمیری یا ڈوگری میں گفتگو کرے، بلکہ روز مرّہ میں صرف اُردو ہی کا اِستعمال ہوتا ہے اور اِس بات پر اُنھیں فخر بھی ہے۔ اکثر کہتے ہیں کہ "پنڈتوں اور کایستھوں نے اُردو کی بڑی خدمت کی ہے۔ مجھے بھی اِس بات پر ناز ہے کہ میں بھی کوثر میں.

ڈھلی ہوئی اِس ٹکسالی زبان کا ادنیٰ سا خادم ہوں۔"

"بالِ عنقا" کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ یہ اشعار پرستارِ اُردو میکشؔ کاشمیری کی اُردو دوستی پر دال ہیں۔

کیوں نہ سر سبز ہو اب گلشنِ اُردو میکشؔ!
خونِ دِل سے اِسے سینچا ہے تو شاداب ہُوا

میکشؔ! یہ بزرگوں ہی کی کوششوں کا ثمر ہے
پہنچی ہے کہاں اُردو زباں آج سنور کر

دُعائیں دیتا ہُوں پیہم کہ اُن کی عُمر دراز
فروغِ اُردو کی خاطر جو کام کرتے ہیں

گل افشاں رہوں کیوں نہ اُردو میں میکشؔ
کہ اُردو زباں سے مِری آبرو ہے

جہاں بھر کی زبانیں اِس پہ اِتنا رشک کرتی ہیں
یہ شیرینی' یہ چٹخارہ مِری اُردو زباں تک ہے۔

اُمید کہ "بالِ ہُما" اور "بالِ عنقا" کے خالقِ میکشؔ کاشمیری کے دِل و ذہن میں اُردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کیلئے ٹھاٹھیں مارتا ہوا یہ جوش و ولولہ ہمیشہ جوان رہے گا اور اُن کی فِکر کے سوتے بھی بدستور پھُوٹتے رہیں گے تاکہ دُوسرے لوگ اُن کی ذات اور اُن کی فکروفن سے اِستفادہ کرسکیں۔

حواشی اور حوالے

۱۔۔۔۔۔راقم نے یہ مضمون ماہنامہ ''سہیل'' گیا کے لیے لکھا تھا اور اِس کی ایک کاپی بذریعہ ڈاک میکشؔ کاشمیری صاحب کو بھی بھیج دی تھی۔ میکشؔ نے مضمون ملنے کے بعد اپنی پسندیدگی اور شکریئے کا اظہار کر کے میری کافی حوصلہ افزائی فرمائی۔

۲۔۔۔۔۔''کچھ اپنے بارے میں''، مشمولہ ''بالِ ہُما''، سنِ اشاعت ۱۹۹۸ء، ص: ۳۱-۳۲

۳۔۔۔۔۔ایضاً۔

۴۔۔۔۔۔مَیں ہفت روزہ ''آرٹ اینڈ لٹریچر'' کے ادبی صفحے کا اعزازی مدیر تھا۔ اِس پرچے کی پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر نسرین اختر قریشی تھیں۔

۵۔۔۔۔۔میرے والد محترم اگرچہ مِڈل پاس تھے اور حکومت جموں و کشمیر کے محکمہ ایکسائز و ٹیکسیشن میں محض گارڈ تھے تاہم جموں کے نمائندہ ادباً و شعراً کے ساتھ اُن کے دوستانہ مراسم تھے۔ میکشؔ کاشمیری کے علاوہ اُن کے رفقاً میں نامور افسانہ نگار مالک رام آنند، ڈاکٹر منظر اعظمی (مرحوم)، پروفیسر محمد سُلطان خان اور مجاہدِ آزادی ماسٹر موہن لعل گپتا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ والد صاحب اکثر رسائل و جرائد کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے سونپ دیتے اور کہتے۔ ''لو پڑھو، اِسے کچھ سیکھو گے۔'' میں کچھ پڑھ سکا نہ سیکھ سکا، البتہ میرے پاس اُردو کا اچھا خاصا مواد جمع ہو گیا جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ ممکن ہے میکشؔ کاشمیری کی یہ نظم بھی میرے والد کی وساطت سے مجھے حاصل ہوئی ہو۔

۶۔۔۔۔۔مکتوب پنڈت کیلاش ناتھ کول میکشؔ کاشمیری، مکتوبہ ۱۵ر دسمبر ۱۹۹۸ء، جموں

۷۔۔۔۔۔ مکتوب پنڈت کیلاش ناتھ کول میکشؔ کاشمیری، مکتوبہ ۲۷ر نومبر ۱۹۹۸ء، جموں

۸۔۔۔۔۔داغؔ دہلوی کے شاگرد نوحؔ ناروی کے اِس شعر۔

اب کیا مَیں کہوں یہ وقت مِرا اور عُمر مِری کیسی گزری
جیسے گُزرا، گُزرا گُزرا، جیسی گُزری، گُزری گُزری

پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے میکشؔ کاشمیری نے ''ایسی شاعری'' الفاظ اِستعمال کئے ہیں۔

۹۔۔۔۔۔مکتوب پنڈت کیلاش ناتھ کول میکشؔ کاشمیری، مکتوبہ ۲۷ر نومبر ۱۹۹۸ء، جموں

۱۰۔ ...... ''غالبؔ یاس اور اُمید کے دوراہے پر''، از میکشؔ کاشمیری، مشمولہ ماہنامہ ''نوری چھم'' (غالبؔ نمبر)، مدیر: نند گوپال باواؔ، شمارہ: ۲-۳،

فروری- مارچ ۱۹۶۹ء

۱۱۔ ...... '' کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور''، از میکشؔ کاشمیری، مشمولہ ماہنامہ '' نوری چھم'' (غالبؔ نمبر)، مدیر: نند گوپال باوا، شمارہ: ۲-۳،

فروری- مارچ ۱۹۶۹ء

☆

☆

کلاسیکی قدروں کا پرستار...... میکشؔ کاشمیری

میں آدم زاد ہوں' ہندو نہ مسلم
یہی ہے مختصر میری کہانی
مجھے جبرئیل نے اُڑنا سِکھایا
عنادل نے سِکھائی نغمہ خوانی
میں ہوں گل پیرہن دھرتی کا باسی
اَجارہ ہے مرا یہ گلفشانی
میں ارضِ زعفراں کا رہنے والا
میرا رنگِ بیاں ہے زعفرانی

(بالِ عنقا)

ارضِ زعفران، وادی کشمیر کے رہنے والے میکشؔ کاشمیری بقولِ جگن ناتھ آزادؔ ''ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔'' ان کے کلام پر رائے دیتے ہوئے آزادؔ لکھتے ہیں: ''میکش کاشمیری ایک دلکش شخصیت کے مالک ہیں اور یہ دلکشی اُن کی شاعری

میں بدرجہ اتم نظر آتی ہے۔ اُن کے کلام میں کشمیر کا حُسن جا بجا اُپنے جلوے بکھیرتا دکھائی دیتا ہے۔ وہی کشمیر کی ہوائی، تازگی اور لطافت، وہی کشمیر کے پھولوں کی خوشبو، وہی کشمیر کے طلوعِ سحر کی تابانی اور وہی شام کشمیر کے بادلوں کے غرقِ شفق ہونے کا منظر اور جہلم کی رُوانی'' (بال عنقا۔ص۔۹) خود میکشؔ کاشمیری نے کئی دلکش اُشعار اُپنے مادرِ وطن سے منسوب کئے ہیں۔

ساغرِ کوثر کی میکشؔ مجھ کو اَب پروا نہیں
جنّتِ کشمیر کا ہر گُل ہے پیمانہ مجھے

یاد آتے ہیں وہ دن جو کبھی میں نے گزارے
کشمیر میں جہلم کے کبھی ڈل کے کنارے

کشمیر کے تو حُسن کا ثانی نہیں کوئی
وہ حُسنِ بخارا ہو کہ ہو حُسنِ سمرقند

کشمیری پنڈتوں نے ایک جانب دیا شنکر نسیمؔ، دتاتریہ کیفیؔ، چکبستؔ اور آنند نرائن ملاؔ جیسے بلند پایہ شاعر اُردو کو دیئے اور دوسری جانب رتن ناتھ سرشارؔ، پریم ناتھ در اور پریم ناتھ پردیسیؔ جیسے نامور نثر نگار۔ اِس بارے میں میکشؔ کاشمیری 'شہپرِ طاؤس' میں رقمطراز ہیں: ''میرے لئے یہ طرّہ امتیاز ہے اور باعث صد افتخار بھی کہ مسلمانوں کے شانہ بشانہ ہندوؤں نے بھی، بالخصوص کشمیری پنڈتوں اور کاُستھوں نے بھی اُردو اور فارسی کے چمنستانوں میں ایسے ایسے سدا بہار گل بوٹے کھلائے ہیں جن کی مہک سے ہمارے مشامِ جاں تا ابد معطر رہیں گے۔'' (شہپر طاؤس، ص۔۱)

میکشؔ کاشمیری اُردو زباں کے ساتھ جنون کی حد تک محبت کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

؎ بجز اس کے نہیں کوئی خواہش تیرے میکش کی
پھلے پھولے الٰہی تا اَبد اردو زبان میری

؎ رُواں رُواں مرا اردو کا نام لیتا ہے
کہ مرا جسم بھی اُردو ہے جان بھی اُردو

؎ اسی میں ہوگی خدا سے بھی گفتگو میکشؔ
کہ روزِ حشر بھی ہوگی مری زباں اردو

؎ گل افشاں رہوں کیوں نہ اردو میں میکشؔ
کہ اُردو زباں سے مری آبرو ہے

البتہ انہیں اس بات کا بھی بخوبی احساس ہے کہ اُردو زباں تقسیم ہند کے بعد سیاست کے ہتھے چڑھ گئی۔ اِس زبان میں لکھنے والوں کو نظر انداز کیا گیا جبکہ دوسری زبانوں میں لکھنے والے ان کے ہم عصر کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ چنانچہ اس بارے میں لکھتے ہیں: ''البتہ کبھی کبھی یہ خیال ضرور کچھ کے لگاتار رہتا ہے اور مجھے پشیمانی کا احساس بھی ہوتا ہے کہ میں نے اپنے اظہار خیال کیلئے اُردو زبان ہی کو کیوں چنا اور اِسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا جبکہ تقسیم وطن کے بعد اس کا اب پُرسانِ حال کوئی نہیں رہا اور اس کی اب وہ پہلی سی مان دان نہیں رہی۔'' (شہپر طاؤس)۔ انکے یہ الفاظ ہر اس ادیب کی بازگشت ہے جس نے اردو سے اپنے خواب سجائے اور قاری نہ ملنے پر دیوناگری میں اپنے دیوان چھپوائے۔ کیلاش ناتھ کول میکشؔ کاشمیری ۱۷ر جولائی ۱۹۲۶ء کے روز سرینگر کشمیر میں پیدا ہوئے۔ پتاجی پنڈت جیون ناتھ کول زباں دان تھے۔ ہندی، فارسی، اردو، سنسکرت اور انگریزی پر دسترس تھی۔ سریکلچر کے محکمے میں ڈائریکٹر تھے اور کتب بینی کے بے حد شوقین تھے۔ میکش

کاشمیری نے روحانیت اور نظریہ وحدت الوجود اپنے والد ہی سے وراثت میں پایا تھا۔ بی اے منشی فاضل اور ایم اے انگریزی پاس کر کے ریڈیو کشمیر سرینگر میں پروگرام اسسٹنٹ کے عہدے پر تعینات ہوئے۔ بعد میں ریڈیو کشمیر جموں کے شعبۂ اردو میں اسسٹنٹ ایڈیٹر بن گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی درس و تدریس کے ساتھ مزید بارہ سال وابستہ رہے۔ بچپن ہی سے شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے۔ مشاعروں اور محفلوں میں شریک ہوتے اور ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے جس کے سبب کئی برگزیدہ ہستیوں سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ جموں میں ایک مشاعرہ کے دوران جوش ملسیانیؔ کے کلام سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کی خدمت میں زانوئے ادب تہہ کرلیا۔ اسی سلسلے سے وہ داغؔ دہلوی اور ابراہیم ذوقؔ کے دلی سکول سے بھی جُڑ گئے۔ اِس خاندان کا ایک اور چراغ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ بھی ان کا معنوی استاد اور رُوحانی مرشد بن گئے۔ جوش ملسیانی کی رحلت کے بعد میکش کاشمیری ڈاکٹر امانت شیخ، سابق صدر شعبہ ہائے اُردو و فارسی پونا یونیورسٹی کے حلقۂ تلامذہ میں شریک ہوگئے۔ بہرکیف ان کے کلام میں جا بجا غالبؔ، داغؔ، اقبالؔ اور جگرؔ کا رنگ ملتا ہے۔ اپنی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''میرے کلام میں نیا رنگ و آہنگ قطعی نہیں کیوں کہ میں جدیدیت کا قائل نہیں، اور صرف کلاسیکی قدروں کا پرستار ہوں...... جب میں نے شاعر مشرق و دانائے راز علامہ اقبالؔ کے کلام کا عمیق مطالعہ کیا اور اس کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کی تو مجھے اس امر کا شدید احساس ہوا اور عرفان بھی کہ 'شاعری جزویست از پیغمبری'۔ (بال عنقا ص۔۱۰)

اقبال کے کلام کی گہرائی اور گیرائی سے میکش کاشمیری اتنے مرعوب ہوگئے

کہ انہوں نے برسوں شعر کہنا ترک کرلیا اور گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ لیکن بعد میں وہ اس ذہنی تعطل سے باہر نکلے اور پھر فعالیت کی یہ حالت تھی کہ زود گوئی کا لیبل چڑھ گیا۔ خود ہی فرماتے ہیں: ''تسلیم کہ میں زود گو ہوں اور بسیار گو بھی مگر اس کو کیا کیجئے کہ جب شعر گوئی کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہے تو اشعار مجھ پر بے تکاں نازل ہوتے چلے جاتے ہیں شاید اِسی کو الہام کہتے ہیں اور خدائے بخشندہ کی بخشش۔'' (شہپر طاؤس۔ص ۷۰)

مجموعہ 'بال عنقا' پر اپنے تاثرات قلمبند کرتے ہوئے امین بنجارہ لکھتے ہیں:

> ''شاعر مشرق علامہ اقبالؔ کی زمینوں میں کہی ہوئی اِن غزلوں میں سادگی وسلامت بھی ہے اور اثر آفرینی بھی۔ بیان کا لطف اور اسلوب کی خوبیاں واضح طور پر نمایاں ہے۔ کلاسیکی اقدار کے علمبردار میکش کاشمیری صاحب نے غزل کی روایت کی پابندی کرتے ہوئے اپنی قلندری اور استغنائی کے جلوے بھی جا بجا بکھیرے ہیں۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ میکش کاشمیری نے روایتی شاعری کو ہی اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ وہ غزل کے دلدادہ تھے حالانکہ رباعی، قطعہ، سلام وغیرہ پر بھی عبور حاصل تھا۔ ان کے کلام میں دوغزلہ، سہ غزلہ اور پنج غزلہ بھی شامل ہیں۔ ان کی زبانوں میں روانی، شیرینی اور مٹھاس ہے۔ پورے کلام میں کہیں کوئی ایسا لفظ نہیں ملتا جو کانوں پر گراں گزرے۔ ان کی شاعری میں تازگی بھی ہے اور نغمگی بھی۔ غزلیہ شاعری میں چونکہ عشق کو ہی عام طور پر برتا جاتا ہے مگر ان کے یہاں یہ عشق عشق مجازی سے کئی منزلیں طے کرتا ہوا عشق حقیقی تک جا پہنچتا ہے۔ جہاں وہ وجود

کی حقیقت، ذاتِ خدا اور ترکِ ترک کی باتیں کرتے ہیں۔ اقبال کی نظم شکوہ سے
تحریک پاکر خود بھی کئی سوالات اٹھاتے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

میکشی

رندِ اس کو جانئے ظرف اِسی کا مانئے
پی کے بہک سکا نہ جو میکدۂ حیات میں

روز شب ملتا ہے پیمانے پہ پیمانہ مجھے
میں نے میخانے کو چھوڑوں گا نہ میخانہ مجھے

وہ اور ہوں گے جو پیتے ہیں بے خودی کیلئے
مجھے تو چاہئے یہ چیز زندگی کیلئے

حسن یار

رُخِ تابناک سے جب کبھی وہ نقاب اُلٹ کے گزر گئے
مجھے بامراد بھی کر گئے، مجھے نامراد بھی کر گئے

وعدہ

وعدۂ دید، وہ بھی حشر کے دن؟
اور وعدہ اگر وفا نہ ہوا؟

وفا

کوئی بھی اس کا خریدار اب نہیں ملتا
بھٹک رہا ہوں میں جنس وفا لئے صاحب

وہ عیادت کو میری آئے کب
سرِ بالیں کھڑی قضا ہے جب

ہجر

رحم کر مجھ پہ شب ہجر! کہاں تک روؤں!
دیکھ یہ دیدۂ پُرآب بھی بے آب ہوا

فراموشی

تو آٹھوں پہر محو ہے یوں یاد میں جس کی
بھولے سے بھی کیا اس نے کبھی تجھ کو کیا یاد؟

ندرتِ خیال

خلوت ہے اور لذتِ گفتارِ یار ہے
تانتا بندھا ہوا ہے سوال وجواب کا

موازنہ کیجئے:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومنؔ

میکش کاشمیری خدا کی بارگاہ میں سوال اُٹھاتے ہیں اور خوب اُٹھاتے ہیں۔ کہیں ان کے کلام میں کشمیری شاعرہ لل دید کی گونج سنائی دیتی ہے اور کہیں پر اقبالؔ کے فلسفہ خُودی کی۔ چنانچہ وہ ہندو فلسفے پر یقین رکھتے ہیں اس لئے آواگون کو اپنے اشعار میں برتتے ہیں۔ وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ بھکتی مارگ گیان مارگ سے کہیں برتر ہے اور اسی مارگ سے ایشور کے ساتھ جلدی ملن ہوسکتا ہے۔ اس خیال کی بازگشت اقبال کے کلام میں بھی ملتی ہے جب وہ عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں۔

ذاتِ خدا:

تو ہے بھی یا نہیں ہے، یہ حقیقت کھل نہیں پائی
فقط ہم سنتے آئے ہیں ترا افسانہ برسوں سے
مکاں سے لامکاں تک بھی تلاشا ہے تجھے ہم نے
مگر پھر بھی نشان تیرا کوئی پایا نہ برسوں سے
تو اے خدا نہاں بھی ہے اور عیاں بھی ہے
کتنے حجاب ہیں ترے، کتنی تجلیات بھی
ہو چشمِ بینا تو دیدار اس کا ہوتا ہے
اگرچہ وہ ہے نہاں پھر بھی ہے عیاں یارو
ہے بھی کہ تو نہیں، بتا، یا یہ فقط فریب ہے
کب سے ہوں منتظر ترا، خود کو تو آشکار کر
خدا کے گھر کا نہ پائیں گے آپ اصل پتہ
صحیفے جتنے ہیں بے شک کھنگالیئے صاحب
نقش ونگار دہر کو کیا دیکھتے ہیں آپ؟
نقاش کو بھی دیکھیئے نقش ونگار میں

آواگون:

فنا کے بعد بھی غم سے مفر نہیں میکشؔ!
اجل تو ایک بہانہ ہے زندگی کیلیئے
تو نے جس موت کو سمجھا ہے مآل ہستی
دیکھ وہ ہستیٔ نو کا کہیں آغاز نہ ہو

دروں بینی:

تیرا خدا تجھی میں ہے اس سے کلام کر
بیکار کیوں اٹھاتا ہے دستِ دعا کوتو

فلسفہ لل دید:

ڈھونڈتا کیوں ہے اس کوتو میکش ناتواں عبث؟
دل ہی میں ہے خداترا، دل ہی میں کائنات بھی
آخر مریم دل ہی میں پایا تجھے مکیں
بھٹکا کہاں کہاں نہ میں کس کس دیار میں؟
جو خود میں ڈوب کر پالے خدا کو
وہی بس واقفِ رازِ خودی ہے

مرضی خدا کی:

یہ اس کا کام ہے سوچے، عبث میں کیوں سوچوں؟
فقیر مجھ کو وہ رکھے، بنائے یا قاروں

بھکتی مارگ:

ملے گی عشق کی منزل تجھے جنوں کے طفیل
نہ آسکے گی ترے کام یہ خرد کی لو
مجذوب میں ہیں عشقِ خدا کی جو مستیاں
پائیں نہ ہم نے زاہدِ شب زندہ دار میں

ترکِ ترک:

تارک اگر بنا ہے تو پھر ترکِ ترک کر
ملنے سے اپنے رَبّ کی تمنا بھی چھوڑ دے

تن/من:

دامن پر یہ داغ ہیں جتنے، دھل دھل کر سب مٹ جائیں گے

سب سے مشکل کام تو بابا من کے میل کو دھونا ہے

انسان کی زندگی پر شاعر نے کئی فکر انگیز شعر کہے ہیں۔ 'بال ہما' میں ایک پوری غزل میں جس کا ردیف زندگی ہے، شاعر نے زندگی کے مفہوم تلاشنے کی کوشش کی ہے۔ چند اشعار:

گرچہ میں زندہ ہوں اب تک اس خراب آباد میں

ڈھونڈتا پھرتا ہوں روز وشب کہاں ہے زندگی

زندگی جہد مسلسل، اک سفر لامنتہی

ہر گھڑی، ہر پل رواں، ہر دم دواں ہے زندگی

ایک دو ہوں امتحان تو شوق سے دے دیں مگر

کیا بتائیں، امتحاں در امتحاں ہے زندگی

بے معنویت

کٹ رہے ہیں زندگی کے دن مرے کچھ اس طرح

جیسے کوئی کشتیٔ بے بادباں ہے زندگی

بے ثباتی

کہاں اب کروفران کا؟ انانیت کہاں ان کی

ملے سب خاک میں جن کو بھی تھا زعمِ خداوندی

کشمکش

لطف وہ آسانیوں میں کب ہے۔ جو مشکل میں ہے؟

جو تلاطم میں مزا ہے وہ کہاں ساحل میں ہے؟

پوچھتے ہو کیوں عبث، باقی ہے کتنا فاصلہ؟
رہرو! لطف سفر تو دوریٔ منزل میں ہے

منزل:

منزل ہوں خود ہی راہ بھی خود، راہ بر بھی خود
کیوں راستہ دکھائے کوئی راہ بر م جھے

رجائیت

مل ہی جائے گی منزل مقصود
تیرے دل میں اگر ہے عزم صمیم
چراغ راہ اگر بجھ گیا تو کیا غم ہے
چراغ دل تو فروزاں ہے رہ بری کیلئے

آج تک میکش کاشمیری کے تین شعری مجموعے منظرعام پر آچکے ہیں۔ ا۔بال ہما۱۹۹۸ء،۲۔بال عنقا۱۹۹۹ءاور شہپر طاؤس ۲۰۰۵ء۔تیسرے مجموعے کے منظرعام پر آنے سے پہلے ہی وہ داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ان کی شاعری میں ذات ہی نہیں بلکہ غم دوراں بھی ہے۔وہ اپنے معاشرے پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔ سماجی، سیاسی اور اخلاقی بدعنوانیوں کو اپنے اشعار کا موضوع بناتے ہیں اور کبھی کبھی ان پر طنز کے تیر بھی چھوڑتے ہیں۔ان کی نظر بلیغ اور فکر بلند ہے۔وہ انسان کو بس انسان دیکھنا چاہتے ہیں، ہندو یا مسلمان نہیں۔وہ ذات پات سے بھی نفرت کرتے ہیں اور کہیں کہیں سائنس اور موڈرن تہذیب کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔

سماجی تناظر:

موردِ الزام کیوں ٹھہرائیں ہم ابلیس کو
حضرتِ آدم نے آدم کو پریشاں کردیا

غضب ہے اپنی ہی تہذیب چھوڑ دی ہم نے
نہ مشرقی ہی رہے ہم ، نہ بن سکے انگریز
سارا جہاں بدل گیا، تیری نظر کو کیا ہوا؟
اُلجھا ہوا ہے بے طرح ترا بھی ذات پات میں
سوچتا ہوں اس سے کیا سدھرے گا یہ بگڑا سماج
یہ نئی پیڑھی ہے ذہنی طور پر بالکل علیل
زلفیں بھی بریدہ ہیں ، سراپا بھی ہے عریاں
اس دور کی مریم کو نہیں شرم وحیا یاد
نئی تہذیب کے اب گل کھلیں گے
میزائل اور ایٹم بم چلیں گے
یہ ہے میزائلوں کا دور، جوہری بم کی بات کر
ترکش و تیزاب کہاں؟ تیغ ونیام سے گزر
بنایا سب کو مٹی سے خدا نے
کسی کو کب کسی پر برتری ہے؟

سیاسی تناظر:

عجب جمہور کا ہے دَور یارو!
جدھر دیکھو ہجومِ خسرواں ہے!
سلطانیٔ جمہور میں ہر شخص ہے آزاد
زنداں میں مگر کتنے ہی اب تک ہیں نظر بند
زباں پہ پہرے بٹھائے گئے ہیں لاکھ ، مگر
متاعِ لوح وقلم کس نے ہم سے ہے چھینی؟

حکمرانوں سے بھلائی کی توقع ہے فضول
بیڑیوں کے ماسوا ہم کو یہ پہنائیں گے کیا؟
یہی کل بن کے لیڈر قوم کے گرجیں گے، برسیں گے
جو زنداں میں پڑے ہیں آج منہ پر جن کے تالے ہیں
نہ جانے کب نظام میکدہ بدلیگا؟ اے ساقی!
وہی مے ہے، وہی میکش، وہی میخانہ برسوں سے
مچی ہے مسلموں میں خانہ جنگی
مسلمانی نہیں، یہ کافری ہے

میکش کاشمیری کی مندرجہ ذیل دو رباعیاں بھی اسی پس منظر میں لکھی گئی ہیں

یہ شبستاں، ناچ گھر عشرت کدے
جنگ کے یہ سازو ساماں، اسلحے
ہم کو لے ڈوبیں گے اک دن دیکھنا
اپنے یہ اعمال بد کے سلسلے

ہر ایک سر میں سیاست، ارے خدا کی پناہ!
نگر نگر میں سیاست، ارے خدا کی پناہ!
سیاسی باتیں تو ہوتی ہیں سب گھروں میں مگر
خدا کے گھر میں سیاست، ارے خدا کی پناہ!

موجودہ معاشرے میں حق تلفی اور بے انصافی کے بارے میں موصوف نے کئی اشعار کہے ہیں۔ حالیہ گھٹناؤں کو دیکھ کر ان اشعار کی معنویت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

امیر جنتے ہیں انصاف پا ہی جاتے ہیں
غریب پر ہے مگر بند کیوں درِ انصاف؟
مجرموں کیلئے عدالت ہے
مارے جاتے ہیں بے گناہ یہاں
اصلی مجرم تو عدالت سے ہُوا صاف بری
جو تھا بے جرم وہی اُلٹا سزا یاب ہوا
خوب ہے یہ سزائے جرم یہاں!
کرے کوئی ، بھرا کرے کوئی

میکشؔ کاشمیری غریبوں، ناداروں اور یتیموں سے محبت کرتے ہیں۔ حالانکہ انہیں قسمت پر بھروسہ ہے تاہم وہ لگن اور محنت کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ انہیں عورت کی زبوں حالی پر بھی رحم آتا ہے۔ معاشرے کے تنزل سے پریشاں ہو کر بعض اوقات وہ ناصحانہ لب و لہجے کو اپناتے ہیں مگر قنوطیت کو اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتے۔

قید پرواز رباعی

ہر کوئی ہے رنگ و بو کے اس جہاں کی قید میں
یا زماں کی قید میں ہے یا مکاں کی قید میں
زندگی پرواز ہی پرواز ہے میکشؔ مگر
ہر کوئی ہے اپنے اپنے آشیاں کی قید میں

اُڑان بھرتے ہوئے ہی سہانے لگتے ہیں
کبوتروں کو نہ ڈربوں میں پالئے صاحب

قسمت

یار روٹھے ،کوئی منا بھی لے
بخت رُوٹھے تو کیا کرے کوئی
قسمت کا کچھ قصور نہ اُن کا قصور ہے
شاید کہیں لگی نہ ہو اپنی نظر مجھے

فریب

کتنے فریب کھائے ہیں اپنوں سے بارہا
اب لگ رہا ہے اپنے ہی سائے سے ڈر مجھے

گناہ

ہو نہ گنہ کا مرتکب ، روزِ حساب یاد رکھ
دہر میں تو سنبھل کے چل،لغزش گام سے گزر

استقلال

ضرورت عزم واستقلال کی ہے،یادرکھ اس کو
کہ ہر اک معرکہ ہوتا ہے سر آہستہ آہستہ

صبر

تسلی بخش ہوتا ہی نہیں ہے کام عجلت کا
کوئی بھی کام کرنا ہو تو کر آہستہ آہستہ

دکھ درد

ہر کوئی باطن میں ہے محوِ فغاں
گو بظاہر ہر کوئی خاموش ہے

یتیموں سے ہمدردی

اسے لختِ جگر اپنا سمجھ، تو پیار دے اس کو

نہیں دیکھی ہے جس نے شفقتِ پدرانہ برسوں سے

عورت سے ہمدردی

عورت کو سمجھتے ہیں ہوس ہی کا کھلونا

کیسے ہیں خداوند! یہ تہذیب کے فرزند؟

غریبوں سے ہمدردی

تڑپ اٹھتا ہوں جب کوئی مجھے غمگین ملتا ہے

فقیرِ بے نوا، بے گھر، کوئی مسکین ملتا ہے

بے کسوں پر ہیں مسلّط آج بھی سرمایہ دار

اِن ستم رانوں کی ہم پر کب ستم رانی نہ تھی؟

کردار

کردار کے اَب غازی کہاں ہے

گفتار ہی کے سارے ہیں غازی

بھلائی کرنا

جو بھلا کے خود کو لگے رہے یہاں دوسروں ہی کے کام میں

وہی کام دنیا میں کر گئے وہی نام دنیا میں کر گئے

۱۹۹۰ء میں وادی کشمیر میں اچانک دہشت گردی نے سر اُبھارا جس کے نتیجے میں ساری کشمیری پنڈت برادری کو ترک وطن کرنا پڑا۔ اس سانحہ نے میکش کاشمیری کے دل پر بہت گہرا گھاؤ پیدا کیا جو ڈھیرے ڈھیرے شعروں میں ڈھلتا

رہا۔ وہ مرتے دم تک اپنے مادر وطن کو ناسٹیلجیا (Nostalgia) کے ساتھ یاد کرتے رہے۔ اقبال کی زمین (شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو) پر میکش نے غزل لکھ کر خدا سے شکوہ کیا ہے کہ کشمیری پنڈتوں کا شیرازہ کیوں بکھر گیا۔ آخر انہیں کس پاداش کی سزا مل گئی۔ ایک دوسری غزل میں وہ کشمیر کے علیحدگی پسند مسلم بھائیوں سے، براہ راست خطاب بھی کرتے ہیں:

سنوارو وادیٔ کشمیر کی زلفیں تو بہتر ہے
تمہیں سونپا گیا ہے کام سارا خلد سازی کا

اسی ضمن میں چند اور اشعار:

پنجاب میں کشمیر میں مارے گئے کتنے
اِس طرح کسی کو کوئی بے موت نہ مارے
پنجاب میں کشمیر میں مارے گئے کتنے
ماں باپ کے پسراں جواں سال وجگر بند
زنار پوش جتنے تھے اب مالک جہاں!
کیوں بے دیار ہوگئے اپنے دیار میں؟
جنت کشمیر کو کس کی نظر یہ کھا گئی؟
غمزدہ سے ہیں شکارے اور ہے خاموش جھیل
وہ گلریز وادی جہاں گل ہی گل تھے
وہاں اب لہو ہی کہو کو بہ کو ہے
وہاں کتنے زیرِ زمیں سو رہے ہیں
کوئی گلبدن ہے، کوئی لالہ رو ہے

پژمردہ گل ہیں، سہمے ہوئے سب طیور ہیں
کشمیر جاؤں کس لئے میکش بہار میں؟
رہ رہ کے نہ آوادیٔ فردوس نُما یاد
اب تیرا فقط نام ہے یا آب وہوا یاد
جہاں میکشؔ کبھی پیدا ہوا تھا
وہ اب وادی کہاں اس کی رہی ہے؟

بقول ڈاکٹر امانت: ''بالِ عنقا میں موصوف نے میرے ایماء پر اقبالؒ کی چند منتخب غزلوں کی زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ مجھے مسرّت ہوئی ہے کہ وہ اس امتحان میں کامیاب اُترے ہیں۔ اقبالؔ یا غالبؔ کی زمینوں میں غزلیں کہنا جُوئے شیر لانے سے کم نہیں اور اگر کوئی شاعر ایسی جسارت بھی کرتا ہے تو اس کی حیثیت آفتاب کے سامنے اَدنیٰ ذرّے سے زیادہ نہیں ہوتی۔'' خود میکش کاشمیری اِس بات پر یقین کرتے ہیں کہ گو شاعری موزوں طبع کی دین ہے مگر ساتھ ہی استاد سے سیکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''نئی نسل تو استادی وشاگردی کی روایت کی قائل نہیں، لیکن چونکہ میں پُرانی قدروں اور روائتوں کا پرستار ہوں، مجھے فخر ہے کہ میں نے اس روایت کو زندہ وتابندہ رکھا ہے اور خود کو اساتذہ کرام کی خاک پا سمجھتا ہوں۔ حصولِ فن اور زباں دانی کیلئے یہ روایت بہت افادی حیثیت رکھتی ہے۔''

اسی موضوع پر میکش کاشمیری کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہر اک کے بس کا نہیں ہے کمال شعر و سخن
جگر کا خون ہے درکار شاعری کیلئے

نہ پہلی سی سخن سنجی ، نہ باقی وہ سخن فہمی
ادب کا اب کہاں سچا کوئی شوقین ملتا ہے

جن کا ادب سے دُور کا بھی واسطہ نہیں
اب ہیں وہی ادیب، عجّب اتفاق ہے

تحت میں شاعر پڑھے اپنی غزل تو ٹھیک ہے
گا کے پڑھنے سے غزل کے عیب چُھپ جائیں گے کیا!

میکشؔ کاشمیری کو یہ قلّق ضرور رہا ہو گا کہ انہیں اُردو اَدب میں وہ پہچان نہیں مل سکی جس کے وہ حقدار تھے۔ قصور نہ اُردو کا ہے نہ اُردو والوں کا۔ یہ سچ ہے کہ تقسیمِ وطن کے بعد یہ زبان سیاست کی قربان گاہ میں شہید ہوئی۔ حکومت نے نہ اُردو کو اِس کا حق دیا اور نہ ہی اُردو اَدیبوں کو۔ مگر بنیادی وجہ کچھ اور ہی تھی۔ انیسویں صدی کی تیسری دہائی کے بعد ترّقی پسندوں نے نظم کی طرف زیادہ دھیان دیا اور روایتی شاعری کو کم تر گردانے کی پوری کوشش کی۔ اکثر و بیشتر شعرا غزل سے منحرف ہو گئے۔ مجروع سلطان پوری جیسے غزل گو نے شعراء کی آواز بھی اس نقار خانے میں دب کر رہ گئی۔ بعد میں رہی سہی کسر جدیدیت کی تحریک نے پوری کر دی۔ جدید غزلیں، آزاد نظمیں یہاں تک کہ نثری نظمیں وجود میں آگئیں۔ قافیہ، ردیف، بحر اور اوزاں کو خیر باد کہا گیا۔ شعرا سہولیت پسند بن گئے اور اس طرح پرانی روائتیں ختم ہوتی چلی گئیں۔ اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ میکش کاشمیری جیسے شعراء جو پرانی روایات کی قندیلیں اٹھائے چلے جا رہے ہیں اردو کی بقاء کیلئے ایسا کام کر رہے ہیں

جس کوسنہرے الفاظ میں لکھا جانا چاہئے ۔آج اگر اردو سے بے بہرہ لوگ ریڈیو یا
ٹیلی وژین پر غزلیں سن کر اپنے سر دھنتے ہیں تو وہ ان ہی شاعروں کی وجہ سے
آخر میں رشی پٹیالوی کے چند اشعار پیش کرتا ہوں جو انہوں نے میکش
کاشمیری کے بارے میں کہے ہیں:

شاعر بھی باکمال ہیں، انسان بھی بے بدل
دنیا میں ایسے رہتے ہیں پانی میں جوں کنول
شعروں میں ٹانکتے ہیں وہ الفاظ کے گہر
رس گھولتی ہے کانوں میں ان کی ہر اک غزل

●

میکشؔ کاشمیری......شخص و شاعر

ریاست جموں و کشمیر کے شعری اُفق پر بعض ایسے شعراء کا نام بھی آتا ہے جنھوں نے اپنے تخلیقی جوہر سے نہ صرف عام لوگوں کو اپنا گرویدہ بنادیا بلکہ اُردو شعر واَدب کی سرکردہ شخصیتوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ وقت کی بے اعتنائی نے اُن کے اَدبی کارناموں کو دبیز پردوں میں چھپالیا ہے اوراِس طرح سے اُن کے ساتھ نہ صرف ناانصافی ہوئی بلکہ آنے والی نسل بھی اس اَدبی اور ثقافتی ورثے سے محروم رہی ہے۔ وشوا ناتھ درماہؔ جموی، قیس شیروانیؔ، فانیؔ پریم نگری، رادھا کشن بھانؔ جنون، نندلال کول ناشادؔ نر، سنگھ سہائے شوقؔ، نرائن جو رینہ عنقاؔ، کوثر سیمابیؔ، جیالال بھانؔ، برق کاشمیریؔ، شام نرائن یکتا، زناردن ٹینگ ساغرؔ، لسہ کول شائقؔ، تاراچند ترسلؔ، سالک قمر کمرازیؔ، دینا ناتھ مٹو دلگیر، نندلال بے غرضؔ، دینا ناتھ چکن مستؔ کاشمیری، نندلال کول طالبؔ کاشمیری، شام لال ایمہ وغیرہ صرف چند نام ہیں جن کے ذکر کے بغیر جموں و کشمیر کی کوئی بھی اَدبی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ پنڈت کیلاش ناتھ کول میکشؔ کاشمیری کا نام بھی شعر اور اَدب کے اِنہی پروانوں میں بڑے احترام کے ساتھ لیا جاسکتا ہے جو گزشتہ کئی دہائیوں

سے اُردو شعر واَدب کی خدمت کرتے آئے ہیں۔

پنڈت کیلاش ناتھ کول میکشؔ کاشمیری ۷ار جولائی ۱۹۱۶ء میں ہفت چنار سرینگر کشمیر کے ایک اہلِ علم کشمیری پنڈت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدِ گرامی پنڈت جیون ناتھ کول ایک پڑھے لکھے اور شریف النفس بزرگ تھے جو ریاست جموں و کشمیر کے سریکلچر محکمہ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ اُپنی ملازمت کے دوران جب اُن کا تبادلہ سرینگر سے جموں ہوا تو وہ اُپنے خاندان کے ساتھ جموں منتقل ہوئے اور یہیں مستقل طور پر رَہائش کرنے لگے۔ چنانچہ اُنہوں نے اَپنے بیٹے کیلاش ناتھ کو رنبیر ہائی اسکول جموں میں داخل کرلیا۔ یہیں سے انہوں نے فارسی اور اُردو کے خصوصی مضامین کے ساتھ میٹرک پاس کیا۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کیلئے جموں کے پرنس آف ویلز کالج میں داخلہ لیا۔ کالج کی فضا اَور یہاں کے علم واَدب کے ماحول نے میکشؔ کو ایک نئ تحریک عطا کی۔ بی اے پاس کرنے کے ساتھ ساتھ میکشؔ نے منشی فاضل کا امتحان بھی امتیاز سے پاس کیا اور پھر پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی اَدبیات میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔

میکشؔ شروع سے ہی شعر واَدب سے شغف رکھتے تھے۔ طالبِ علمی کے زمانے میں وہ اکثر مصرعے موزوں کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ چونکہ اُردو اور فارسی ان کے من پسند مضامین میں سے تھے اِسلئے بچپن سے ہی اُساتذہ کا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ سکول کے زمانے میں مولوی سلام شاہ اور پنڈت وشوا ناتھ درماہؔ جموی کی حوصلہ افزائی سے ان کے اس شوق کو اور بھی تقویت مل گئی۔ شاعری سے ان کی دلچسپی دیکھ کر مرحوم ماہؔ انہیں مولانا کے نام سے پکارتے تھے۔ خود اِن باتوں کا انکشاف کرتے ہوئے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"طالبِ علمی کے زمانے میں اُردو اور فارسی میرے من پسند مضامین تھے اور میں ہر جماعت میں اِن میں اوّل رہا کرتا تھا۔ اگرچہ میں اُس وقت بھی نظمیں لکھ لیا کرتا تھا اور اوٹ پٹانگ قسم کے شعر کہہ لیتا تھا، تاہم میرے دو شفیق مدرسین مولوی سلام شاہ صاحب اور پنڈت وشواناتھ درماہ جموّی صاحب میری حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے۔ ماہ صاحب اکثر میرے والد صاحب سے ملنے تشریف لایا کرتے تھے اور مجھے مولانا کہہ کر پکارا کرتے تھے"۔[1]

میکشؔ کاشمیری کو شروع سے ہی علامہ اقبالؔ سے گہری عقیدت تھی۔ اُنھوں نے بچپن میں نہ صرف اقبالؔ کے کلام کا مطالعہ کیا تھا بلکہ ان میں سے بعض اشعار ایسے تھے جو ان کے وردِ زبان تھے۔ وہ علامہ اقبالؔ کو اپنا رُوحانی مرشد تصوّر کرتے تھے حتیٰ کہ اِسی رنگ میں شعر کہنے لگے اور یہ سلسلہ عمر بھی جاری رہا۔ ایک ملاقات کے دوران میرے پوچھنے پر اُنہوں نے فرمایا:

"میرے والدِ بزرگوار اُردو کے عالم تھے۔ فارسی سے بھی شغف رکھتے تھے اور فرانسیسی زبان بھی جانتے تھے۔ میرے گھر میں پہلے سے ہی پیامِ مشرق، بانگِ درا، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم موجود تھیں جن کا والد صاحب مطالعہ کیا کرتے تھے۔ روحانیت کی طرف بھی اُن کا دھیان تھا۔ انگریزی میں اُپنشد کی کتابیں بھی ان کے زیرِ مطالعہ رہتی میں، جو اَب تک موجود ہیں۔ اِس طرح سے بچپن میں مجھے اقبالؔ کا کلام پڑھنے کا اتفاق ہوا اور میں انہیں اپنا رُوحانی مرشد تصوّر کرنے لگا۔ البتہ میری والدۂ محترمہ جو لاہور کے کشمیری پنڈت گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں ان میں تھوڑا بہت شوق تھا۔ وہ اُردو اور ہندی پڑھ لیتی تھیں۔ شاید یہی سنسکار مجھ میں ہیں۔ باقی میرے بچوں کو شعر و شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں"۔

---

[1] میکشؔ کاشمیری: بالِ ہما (اوّلین شعری مجموعہ) ص ۲۷

تعلیم مکمل کرنے کے بعد میکشؔ ذریعۂ معاش کی تلاش میں بھٹکنے لگے۔ اُسی زمانے میں جموں میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا جو سب سے پہلے رنبیر ہائی سکول کے احاطے میں واقع تھا۔ چنانچہ میکشؔ کاشمیری اسکرپٹ رائیٹر کے طور پر یہاں ملازم ہو گئے۔ ریڈیو جموں کے سب سے پہلے ڈائریکٹر اُردو کے مشہور ناول نگار اور افسانہ نگار جناب راجندر سنگھ بیدی مقرر ہوئے۔ وہ بڑے نبض شناس تھے۔ انہیں میکشؔ کی صلاحیتوں کا شروع سے ہی علم تھا۔ وہ اکثر اُنہیں اَپنے کمرے میں بُلا لیا کرتے تھے اور مختلف علمی واَدبی معاملات پر تبادلہ خیال کرتے تھے۔ اُس زمانے میں ریڈیو سے ایک نیا پروگرام "جُوتیوں کی دال" شروع ہُوا تھا اور ریکارڈنگ کا سلسلہ نفی کے برابر تھا۔ اِس طرح سے جو بھی پروگرام ہوتا تھا وہ بِلا کسی رُکاوٹ براہِ راست نشر ہوتا تھا۔ بیدی صاحب کی رہنمائی میں میکشؔ نے اِس پُروگرام میں ایک نئی رُوح پھونک دی اور اَپنی خداداد صلاحیت سے اِس پروگرام کو سدا بہار بنا دیا۔ ایک انٹرویو کے دوران انہوں نے میرے ایک استفسار کے جواب میں فرمایا:

"راجندر سنگھ بیدی صاحب تحریر کے بادشاہ تھے۔ اِتنا خوبصورت دستخط تھا ان کا اور وہ Extempore بولتے تھے، جو بھی جُملہ ایک بار لکھتے تھے، اس کو کبھی نہیں کاٹتے تھے۔ مجھے اکثر اَپنے کمرے میں بُلایا کرتے تھے اور کبھی کبھی اسکرپٹ ڈکٹیٹ کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی میں اس میں کوئی نہ کوئی شعر لگا لیا کرتا تھا تو خوش ہو جاتے تھے، اُس زمانے میں ایک نہایت ہی دلچسپ پروگرام 'جُوتیوں کی دال' شروع ہوا تھا۔ جس میں ظاہر ہے بیدی صاحب کی رہنمائی اور میری اَنتھک محنت شامل ہوتی تھی۔ یہ پروگرام اس زمانے میں مقبولِ عام ہوا تھا۔ حالانکہ ہمارے پاس کسی قسم کا سامان نہیں تھا کیونکہ اسٹیشن نیا نیا ہی بنا تھا۔ اِس طرح سے میرا بیدی

صاحب کے ساتھ صرف چھ ماہ تک ساتھ رہا۔ یہ ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔"[1]

۱۹۴۹ء میں جب ریڈیو کشمیر سرینگر وجود میں آیا تو میکش صاحب کو بھی تبدیل کر کے سرینگر بھیج دیا گیا۔ یہاں بھی انہیں کافی محنت اور جانفشانی سے کام کرنا پڑا اور اُپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لانی پڑیں۔ وہ صرف تین ماہ تک سرینگر میں رہے۔ میکش صاحب کو ایک زمانے میں نامعلوم وجوہات کی بناء پر ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اِس طرح سے اُن کا دل ٹوٹ گیا۔ جموں واپس آ کر اُنہوں نے کچھ عرصہ کیلئے سناتن دھرم اسکول میں درس وتدریس کا کام سنبھالا۔ اِس کے بعد ماڈل اسکول میں بھی وہ کئی سال تک بچوں کو تعلیم و تربیت دیتے رہے لیکن تقدیر بھی کیا کھیل کھیلتی رہتی ہے۔ انہیں پھر سے ریڈیو کی خدمات کیلئے طلب کیا گیا۔ پہلے اسکرپٹ رائٹر کے طور پر کام کرتے رہے، بعد میں انہیں اسسٹنٹ ایڈیٹر شعبہ اُردو و کشمیری تعینات کیا گیا۔ اُس زمانے میں جب اُس وقت کے پرائم منسٹر شیخ محمد عبداللہ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ ریڈیو جموں سے بھی کشمیری زبان میں ایک پروگرام شروع کیا جائے۔ چنانچہ 'پمپوش' کے نام سے ایک علمی وادبی پروگرام شروع کیا گیا۔ جس کی ترتیب میکش صاحب کے سپرد کی گئی۔ میکش نے یہ چیلنج بھی قبول کیا۔ حالانکہ وہ خود کشمیری نہیں بول سکتے تھے لیکن اِس زبان کو سمجھ سکتے تھے۔ وہ اِس زبان کے فن پاروں کو آسانی سے دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کی صلاحیت ضرور رکھتے تھے۔ میرے ایک استفسار کے جواب میں اُنہوں نے مجھے بتایا:

"اُس زمانے میں ریڈیو سے ایک نیا پروگرام شروع ہوا۔ اُس کا نام پمپوش رکھا گیا۔ یہ خالص کشمیری علمی وادبی پروگرام تھا۔ حالانکہ میں کشمیری اتنی بول نہیں سکتا تھا لیکن یہ زبان ضرور سمجھ میں آتی تھی اور میں اس کے فن پاروں کو آسانی سے انگریزی،

[1] میکش کاشمیری کے ساتھ ایک گفتگو۔

پنجابی اور اُردو میں منتقل کر سکتا تھا۔ میں کشمیری آرٹسٹوں اور فنکاروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لایا کرتا تھا اور پروگرام ترتیب دیتا تھا۔ میری اَنتھک محنت ہی اس پروگرام کی کامیابی کا ضامن تھا۔"

میکشؔ صاحب خداداد صلاحیت کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنی ۳۴ سالہ ریڈیائی سروس کے دَوران بہت سے تجربے حاصل کیے۔ عوام کی دلچسپی کیلئے نئے نئے پروگرام رُوبہ عمل میں لائے۔ کُل ہند پیمانے پر مشاعرے کروائے، مختلف موضوعات پر باصلاحیت اَدیبوں سے مضامین لکھوا کر پیش کیے۔ اَچھے اور منجھے ہوئے مقرّرین سے مقالات لکھوائے۔ مقامی صحافیوں سے وقت کی بات پروگرام کیلئے تبصرے کروا کر نشر کرتے رہے۔ "کہکشاں" کے نام سے اُردو اَدبی پروگرام شروع کیا جو نہایت ہی مقبول رہا۔ بعد میں اِس پروگرام کا نام "محفل" رکھا گیا اور اَب اِس پروگرام کا نام "خرمن" ہے۔ خود بھی مخالف پروپیگنڈہ پروگرام ڈنکے کی چوٹ کیلئے لکھتے رہے جو سالہا سال تک ریڈیو جموں سے نشر ہوتا رہا۔ اِس کے علاوہ غنائیے، منظوم فیچر اور بے شمار اَدبی و نیم اَدبی تقاریر لکھیں جن کو لوگوں نے کافی سراہا اور اِس طرح سے میکشؔ اُردو زبان واَدب کی بے لوث خدمت کرتے رہے۔

میکشؔ کاشمیری کے دو شعری مجموعے بالِ ہما (۱۹۹۸ء) میں اور بالِ عنقا (۱۹۹۹ء) میں شائع ہوئے ہیں۔ دونوں جاذب نظر اور توجہ طلب شعری مجموعے ہیں۔ بالِ ہما میں غزلیں بھی ملتی ہیں اور دوغزلے بھی، منظومات بھی اور سخن پارے بھی۔ اِن کے دونوں شعری مجموعے قابل مطالعہ ہیں اور غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ میکشؔ کاشمیری علامہ اقبالؔ سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ اقبالؔ سے انہیں اِتنی عقیدت تھی کہ وہ اُن کو اپنا رُوحانی مرشد تصور کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بالِ جبریل کی تقلید میں اپنے اَوّلین شعری پیشکش کا نام بالِ ہما رکھا۔ میرے ایک استفسار کے جواب میں وہ لکھتے ہیں:

"میری اپنی دُنیا ہے اور میں اِسی میں مست رہتا ہوں اور میرے کلام کا رنگ و آہنگ سب سے الگ تھلگ اور جُداگانہ ہے
ے نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
شاعر مشرق، دانائے راز علامہ اقبالؒ میرے روحانی مرشد ہیں اور میں قدامت پسند ہوں مگر جس عالم میں ہوں خوش و خرم ہوں اور شاد کام ہوں"۔[1]

علامہ اقبال کے ساتھ ساتھ اُن کے ہاں غالب، داغ، جگر، ذوق، فراق، سودا اور جوش کا رنگ بھی ملتا ہے لیکن اِن تمام اساتذہ کے رنگ کے ساتھ ساتھ اُن کا خود اپنا رنگ بھی ہے جو بہت ہی نمایاں ہے۔ میکش جدید شاعری کے قائل نہیں۔ وہ قدامت پسند شاعر ہیں کیونکہ انہیں کلاسیکی شاعری کے رچاؤ کا زبردست احساس تھا۔ وہ شاعری کو جزویست از پیغمبری کا درجہ دیتے تھے اور اِسی پر عمر بھر کاربند رہے لیکن وہ جدیدیت کو یکسر نظر انداز بھی نہیں کرتے تھے بلکہ اُن کی شاعری کلاسیکی اور جدید رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ اگرچہ وہ بار بار جدیدیت سے مُنہ موڑتے تھے لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ ان کے ہاں عصری آگہی کا عرفان بھی جگہ جگہ ملتا ہے۔ جس کا احساس خُود ان کو بھی تھا۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

شاعری میری زندہ جاوید
جو بیک وقت ہے جدید و قدیم

اِس بات کی طرف پہلے ہی اِشارہ کیا گیا ہے کہ میکش کاشمیری، کشمیری پنڈتوں کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ بچپن کے بے فکر لمحات کشمیر میں گزارے لہٰذا ان کی شاعری میں سرزمین کشمیر کی بُوباس بہ درجہ اُتم ملتی ہے۔ وہ کشمیری ہونے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ وہ ان لمحات کو اکثر یاد کرتے تھے جو انہوں

[1]...... راقم السطور کے نام میکش کاشمیری کا ایک خط۔

نے کشمیر کی کھلی فضاؤں میں گزارے تھے۔ انہیں کشمیر کے مناظر، یہاں کا کلچر اور تہذیب نہایت ہی عزیز تھا۔ وہ اُن اَیام کو یاد کرتے تھے اور دل ہی دل میں جھوم اُٹھتے تھے جو اُنہوں نے اپنے آبائی مکان میں گزارے تھے۔ یہاں اِس بات کا اعادہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ کشمیر نہ صرف کشمیر میں رہنے بسنے والے شعراء کا من پسند موضوع رہا ہے بلکہ اِس موضوع میں اتنی بوقلمونی ہے کہ یہ موضوع کشمیر سے باہر اقامت پذیر شعراء کا بھی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اقبالؔ، چکبستؔ، بشن نرائن درابرؔ، برج موہن دتاتریہ کیفیؔ، تربھون ناتھ ہجرؔ، آنند نرائن مُلاؔ جیسے شعراء کا سرزمینِ کشمیر کے ساتھ رشتے سے کون کا فرانکار کرسکتا ہے۔ میکشؔ اگرچہ جموں میں پلے بڑھے اور جوان ہوئے لیکن اُن کا تعلق براہِ راست کشمیر سے تھا۔ اُنہوں نے بھی اِس موضوع پر بڑی دلاویز نظمیں لکھی ہیں جن میں دَرد بھی ہے اور کسک بھی، فضا آفرینی بھی ہے اور نغمگی بھی۔ پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ، بالِ ہما میں کشمیر کے حوالے سے میکشؔ کاشمیری کا تعارف یوں کراتے ہیں:

> 'دنیا کی شاعری کو کشمیر ہی کی دَین ہے۔ میکشؔ کاشمیری کا تعلق بھی شعراء کی اُس جماعت سے ہے جس کے اَرکان کشمیری نژاد ہیں اور جنھیں کشمیری نژاد ہونے پر فخر ہے۔''

کشمیر سے اَپنی بے پناہ عقیدت کا جذبہ میکشؔ اِسی شاعری میں بار بار دِلاتے ہیں۔ وہ کشمیر کو کبھی بھارت کا مکٹ تصور کرتے ہیں اور کبھی اِس کو خلدِ جاوداں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کبھی اِس میں گُلِ نرگس اور نسترن کی خوشبو محسوس کرتے ہیں اور کبھی اس کو وادیٔ پمپوش کا نام دیتے ہیں۔ اَپنے اشعار میں اَپنے مادرِ وطن کشمیر کا ذکر والہانہ انداز میں کرتے ہیں۔ مثلاً چند اشعار ؎

اے مرے خلدِ جاوداں — تیرا جواب ہے کہاں !
تری ثنا ہو کیا بیاں! — تو ہے بہشتِ گُل فشاں
نام ترا ہے حرزِ جاں — تو ہے عزیزِ قدسیاں
طواف میں تیرے آسماں — تجھ پہ خدا ہے مہرباں
ذرّے ہیں تیرے کہکشاں — تیری اُدائیں دِلستاں
تیری ہوائیں مے فشاں — تیری فضا میں مستیاں
کیسے کِھلے ہیں بوستاں — جن میں طیورِ نغمہ خوان

(خلدِ جاوداں کشمیر)

☆

ترے نصیب میں یہ وسعتیں فلک کی کہاں — اُڑان تری اگر مثلِ شاہباز نہیں
شبستان وقصر شہی جل رہے تھے — نگاہِ قلندر شررّ بار کیا تھی
کردار کے اَب غازی کہاں ہیں! — گفتار ہی کے سارے ہیں غازی
ہر نالہ شب میرا بے کار ہوا ثابت — کام آ نہ سکی کچھ بھی یہ آہِ سحر گاہی
عرشِ بریں سے بھی پرے تیرا مقام ہے بشر — انجم و کہکشاں تو کیا ماہ تمام سے گزر

☆

رُوح پَرور جاں فزا اس کی فضا

کیف سے معمور ہر موجِ ہوا

جابجا تسنیم و کوثر ہیں رَواں

ذرّہ ذرّہ اس جگہ ہے گل فشاں

ہر طرف طوفان رنگ و بو بپا

جاذبِ قلب و نظر اِک اِک اَدا

(خطہ کشمیر)

میکشؔ نے صرف کشمیر کو ہی اَپنی نظموں کا موضوع نہیں بنایا بلکہ عام موضوعات پر بھی بڑی دلآویز نظمیں لکھی ہیں۔ وہ مدر ٹریسا کی سماجی خدمات سے بھی بے حد متاثر نظر آتے ہیں اور انہیں فرشتۂ رحمت قرار دیتے ہیں۔ وہ ممتا، پیار اور انسانیت کے تیئں اُن کی بے لوث خدمات کو یاد کرتے ہیں۔ میکشؔ کہتے ہیں کہ مدر ٹریسا بے شمار یتیموں، ضعیفوں ، بیکسوں اور پریشاں حال لوگوں کے دُکھ درد کا عمر بھر مداوا کرتی رہیں۔ انہوں نے حاجت مندوں، بوڑھوں، بچوں کی خدمت کرنا اپنی زندگی کا شعار بنایا تھا۔ وہ ہمیشہ اَپنے اُصولوں پر کاربند رہیں۔ میکشؔ اَپنی اِس نظم میں مدر ٹریسا کی خدمات کا بڑی دلنشین انداز میں الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ۔

مدر بے شک نحیف وزار لوگوں کی مسیحا تھی

پریشاں حال، دل فگار لوگوں کی مسیحا تھی

لگاتی تھی گلے اُن کو نہ تھا جن کا کوئی پرساں

یتیموں ، کوڑھیوں، بیمار لوگوں کی مسیحا تھی

وہ مشفق ماں تھی ان سب کی جو ممتا کو ترستے تھے

جو بیچارے تھے ان لاچار لوگوں کی مسیحا تھی
وہ ممتا، پیار اور بے لوث خدمت کا فرشتہ تھی
وہ اِس دنیائے آب وگِل میں رحمت کا فرشتہ تھی

(فرشتہ رحمت۔ مدرٹریسا)

میکش "جھیل مانسر کے کنارے ایک شام" میں بڑی دلنشین انداز میں جموں کی اِس مشہور جھیل کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ وہ جموں شہر کے بیچوں بیچ گزرتی ہوئی بل کھاتی ہوئی نہر کی بھی ایک مصوّر کی طرح مناسب الفاظ کے ذریعے سے نقاب کشائی کرتے ہیں اور دریائے توی کے کنارے صدیوں سے نظر آتے ہوئے گول پتھروں کی بھی بڑی خوبصورتی سے عکاسی کرتے ہیں۔ 'بالِ ہما' میں توبہ کے نام سے ایک طنزیہ نظم بھی ملتی ہے، جس میں عصری آگہی کا عرفان نظر آتا ہے۔ میکش امام عالی مقام حضرت امام حسینؑ کے حق کیلئے شہادت پر بعض فکر انگیز سلام بھی ضبطِ تحریر میں لاچکے ہیں۔ اِن میں بھی اُن کی فنکارانہ چابکدستی جابجا ملتی ہے۔ اِس طرح سے پتہ چلتا ہے کہ میکش نہ صرف ہر ایک مذہب، ہر ایک فرقے اور ہر ایک انسان کو عزیز رکھتے تھے بلکہ وہ انسانیت کا احترام کرنے کے رَوادار تھے۔ چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

سلام اُس پر کہ جس نے حق کی خاطر جان تک واری
لُٹا گھر بار سارا، اِس پہ بھی ہمت نہ ہاری

(سلام)

حق کیلئے حسینؓ نے سر اپنا دے دیا
کتنی ہے بے مثال شجاعت حسینؓ کی

(عالی مقام حضرت امام حسینؑ)

میکشؔ کی ایک طنزیہ نظم کے چند شعر ملاحظہ کیجیے۔ اِس نظم میں عصرِ حاضر کے انسانی زندگی کا خاکہ ملتا ہے۔ نظم کے چند بند آپ بھی سُن لیجیے اور داد دیجیے:

کیسا کلجگ کا ہے اَثر آ توبہ	ہر بشر میں ہے شر ہی شر توبہ
کتنا اَب پست ہو چکا انسان	دل میں مطلق نہیں ہے ڈر توبہ
حرکتوں سے درندگی ٹپکے!	کتنی خون خوار ہے نظر توبہ
زَر ہی زر کی ہوس ہے سودا ہے	پھر گئے ہیں سبھی کے سر توبہ
خادمِ قوم، اَب کہاں نیتا	ہر کسی میں ہے حرصِ زر توبہ!
کس سے اَب رہبری کی ہو اُمید	راہ زن جب ہیں راہ بر توبہ
رقص گاہوں میں ناچ ڈسکو کا	اور ماں باپ بے خبر توبہ
یہ ہمارا ہے فرض ہم جانیں	اِس سے ہوتا ہے جو ضرر توبہ
کچھ بھی بگڑا نہیں ہے اے میکشؔ	اَب بھی کر لے بشر اگر توبہ

(توبہ)

میکشؔ نے غزل گوئی میں بھی اَپنے جوہر دکھائے ہیں۔ اُن کی غزل میں اُن کے جذبات کھل کر اُمڈ کے آئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ غزل کے مزاج سے کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں۔ انہیں پُرانی قدروں کا بھرپور احساس ہے۔ ان کی غزل میں روایت کا رنگ غالب ہے لیکن اِس رنگ کے ساتھ ساتھ وہ اپنا ایک انفرادی رنگ بھی رکھتے تھے۔ میکشؔ کا مطالعہ گہرا تھا۔ وہ زمانے کے سرد و گرم سے واقفیت رکھتے تھے۔ وہ بات کو گھُما پھرا کر کہنے کے قائل نہیں تھے بلکہ اُپنے جذبات و احساسات کو صحیح ڈھنگ میں پیش کرنے کا گہرا ادراک رکھتے تھے۔ میکشؔ کو وہ زمانہ نصیب ہوا جو ہندوستان میں سیاسی اُتھل پتھل کا زمانہ تھا۔ ہندوستان کی تمام

ریاستوں کی طرح ریاست جموں وکشمیر بھی اس کی لپیٹ میں آئی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں وطن تقسیم ہوا۔ یہ انسانیت کے ماتھے پر ایک بدنما داغ تھا۔ بٹوارے سے جہاں وطن انگریزوں کی چنگل سے آزاد ہوا وہاں بہت سارے مسائل پیدا ہو گئے۔ ادیب اور شاعر بھی اِن مسائل سے دوچار ہوئے اور اپنے فن پاروں میں اِن تمام حالات کی تصویر کشی کرنے لگے۔ چنانچہ میکش کی شاعری میں ایسے اشعار کی کمی نہیں جن سے یہ درد وکرب محسوس کیا جاسکتا ہے۔ میکش اِس دور کی عکاسی کرتے ہوئے اپنے مجموعۂ کلام "بالِ ہما" میں رقمطراز ہیں:

"دیش کے بٹوارے سے تین چار برس پہلے کی بات ہے کہ ہماری ریاست میں صرف ایک ہی بزم ہوا کرتی تھی۔ بزم اُردو جموں وکشمیر اور اس کے جنرل سیکرٹری اس وقت کے مشہور ومعروف ادیب اور نقاد چستی غلام حیدر صاحب کے سخنور بھانجے جناب قیس شیروانی نظامی گنجوی تھے...... چند ماہ کیلئے میں اس بزم کا جوائنٹ سیکرٹری بھی رہا اور پھر لاہور ایم اے کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے چلا گیا۔ جب وہ زمانہ یاد آتا ہے اور اپنے بچھڑے ہوئے احباب نہیں ملتے تو کلیجہ مسوس کر رہ جاتا ہوں۔ کچھ تو پاکستان ہجرت کر گئے اور کچھ اللہ کو پیارے ہو گئے"۔[1]

ملک کی تقسیم سے نہ صرف جان ومال کا نقصان ہوا بلکہ بزم اُردو جموں وکشمیر کا شیرازہ بھی بکھر کے رہ گیا۔ محمود ہاشمی، عبدالحمید نظامی، فضل حسین کیف اسرائیلی، خواجہ علیم یزدانی، مصور قریشی، حبیب کیفوی، شیخ گلزار احمد فدا، لاغر جموی، کوثر سیمابی، منوہر لال دل، ہدایت اللہ قوت، بشارت فارانی، ظفر کاظمی، راوٗ پریتم چند، عمادالدین سوز، کشمیری لال ذاکر، چودھری حسن محمد منہاس، قاضی نظام الدین، منگیرام وفا، نرسنگھ سہائے شوق، اللہ رکھا ساغر، گردھاری لال تمنا، اثر صہبائی، امین حزین اور عزیز کاوش اور اِس قبیل کے اَن گنت قلمکار شاعر اور ادیب نہ جانے کہاں

---

[1]..... میکش کاشمیری: بالِ ہما ص ۲۸۔۲۹

کہاں بھٹک گئے۔ ایک طوفان آ گیا جو سب کو بہا کے لے گیا۔ لیکن اُ پنے مادرِ وطن
کے تئیں شاعروں اور اَدیبوں کا عقیدت کا جذبہ کم نہیں ہوا۔ اِس حال میں بھی یہ فنکار
کام کرتے رہے۔ چنانچہ محمود ہاشمی کی "کشمیر اُداس ہے"، حبیب کیفوی کے کشمیر میں اردو
اور کشمیری لال ذاکر کے بے شمار ناول اور افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ میکش کی
شاعری میں تقسیم ملک کی تباہ کاریوں کا بخوبی اِشارہ ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تقسیم سے
انسانیت کا خون ہو گیا ہے۔ ہر طرف طوائف الملوکی اور اِنتشار پھیلا ہوا ہے۔
غربت، افلاس، محرومی اور لاچارگی کا سایہ چاروں اور منڈلا رہا ہے۔ ہند پاک کے
آپسی تناؤ اور ٹکراؤ نے اِنسان کو بے حسین بنا دیا ہے۔ انسان زندگی سے حد سے زیادہ
بَددِل ہو گیا ہے لیکن میکش پر اُمید ہے کہ اگر انسان چاہے تو پل بھر میں آپسی جھگڑے
مٹ سکتے ہیں اور حوصلہ بخش نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

اب بھی کر لے اگر بشر توبہ! ؏ کچھ بھی بگڑا نہیں ہے اَے میکش
وہ بھارتی ہو کہ پاکی کہ مصری و چینی ؏ سبھی ہیں ایک چمن کے طیورِ خوش الحاں
باہم آغوش سحر شام ہوئی جاتی ہے ؏ کفر و اسلام گلے ملتے ہیں باہم میکش

اَب دیکھئے بٹوارے سے انسان کی بے راہ روی کا جائزہ کس طرح لیتے
ہیں۔ کہتے ہیں

منتشر اَپنے وطن کا مجھ کو شیرازہ ملا ؏ ہر طرف نفسا نفسی یا الگ صوبے کی مانگ
ہیں کرائے کے سب گواہ یہاں ؏ کیوں نہ ملزم بری ہو باعزت
پھر بھی کتنے ہیں بے پناہ یہاں ؏ اَب تو آدھی صدی بھی بیت چلی
چاہے جو بھی کسی کا ہو مذہب ؏ میکدے میں سبھی برابر ہیں

'بالِ ہما' میں بعض قطعات اور رباعیات بھی نظر نواز ہوتے ہیں۔ ان میں

بھی میکشؔ نے اپنے پسندیدہ موضوعات کو بروئے کار لایا ہے۔ یہاں بھی ایک طرف حسن و عشق کے جذبات اُمڈ کے آئے ہیں وہاں دوسری طرف میکشؔ نے دُنیاوی مسائل کا بھی احاطہ کیا ہے اور اُپنے مخصوص انداز میں انسانی زندگی کے درد و کرب کا نقطہ بڑے دلنشین انداز میں کھینچا ہے۔

دیکھئے اُپنے اِس قطعے میں وہ اُپنا مسلک کیسے بیان کرتے ہیں:

لبیک سدا کہنا میرا مسلک ہے ۔۔۔ خاموشی سے غم سہنا مرا مسلک ہے
راضی بَرضا رہنا میرا مسلک ہے ۔۔۔ تو جیسے بھی رَکھے گا رہُوں گا یارب

دیکھئے خدا کی عظمت میں کیسے رطب اللسان ہیں:

تتلی میں بھی تیری ہی شباہت دیکھی ۔۔۔ ہر گل میں تری رنگت و نکہت دیکھی
ہر شکل میں یارب تیری صورت دیکھی ۔۔۔ آیا نہ نظر کوئی مجھے ترے سوا

اُپنے اِس قطعے میں بڑے پتے کی بات کہتے ہیں:

دیندار کہاں! صاحب ایماں ہیں کہاں اُب ۔۔۔ وہ دَھرم کے اُپکا کے ساماں ہیں کہاں اُب
تھے واقعی مومن جو مسلمان ہیں کہاں اُب ۔۔۔ شائستہ زنار برہمن بھی کہاں ہیں!

میکشؔ کا دوسرا شعری مجموعہ بالِ عنقا کے نام سے ۱۹۹۹ء میں منظرِ عام پر آیا۔ انہوں نے اِس شعری مجموعے کا آغاز اُپنے ایک شعر سے کیا ہے:

خدا کی دین ہے میکشؔ بصورتِ الہام
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے!

بالِ عنقا کے آغاز میں وہ اپنا منظوم تعارف پیش کرتے ہیں جو قابلِ مطالعہ ہے۔ اُپنے اِس تعارف میں بھی اُنھوں نے اُپنے مرشدِ فن علامہ اقبالؔ کی تراکیب اور علایم سے کام لیا ہے۔ اِس کے بعد میکشؔ کے دو نثری نمونے سامنے آتے ہیں

جن میں وہ اپنی شاعری کے بارے میں وضاحت سے گفتگو کرتے ہیں۔ اِس بات میں کوئی شک نہیں کہ میکشؔ، علامہ اقبالؔ کے شروع سے ہی پرستار تھے۔ اُن کو کلامِ اقبالؔ سے بچپن سے ہی آشنائی تھی۔ وہ اقبالؔ کی شخصیت اور شاعری سے اِتنے متاثر تھے کہ انہیں ضبطِ نفس، صبر وایثار اور عمل پیہم کا اوّلین درس یہیں سے حاصل ہوا۔ وہ بچپن سے ہی کلامِ اقبال کو اَپنا قیمتی اَثاثہ سمجھنے لگے اور اُن کے اَشعار کے مفاہیم سے آگہی اور بصیرت حاصل کرتے رہے۔

بالِ عنقا میں میکش کی ۴۶ ایسی غزلیں شامل ہیں جو علامہ اقبالؔ کی زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ اِن میں سے بعض سنگلاخ زمینیں بھی ہیں اور آساں اور سہل بھی۔ میکشؔ خود اُستادِ فن تھے۔ انہیں فن شاعری کے رموز سے پوری پوری واقفیت تھی۔ عروض کا بھی گیان تھا اور الفاظ کے دروبست سے بھی وہ آشنا تھے۔ اِس لئے انہیں علامہ اقبالؔ کے مصارع طرح پر غزلیں کہنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی بلکہ وہ بِلا کسی رُکاوٹ کے غزلیں کہتے رہے اور ایک خاص قسم کی آسودگی حاصل کرتے رہے۔ یہاں اِس بات کا ذکر کرنا لازمی بن جاتا ہے کہ میکشؔ اپنی شاعری کے آخری دَور میں ڈاکٹر امانت شیخ سے شعر واَدب پر مشورہ لیا کرتے تھے۔ اِن ہی کی فرمائش پر میکشؔ نے اقبالؔ کے اِن مصارع طرح پر طبع آزمائی کی۔ جس کا اعتراف وہ خود الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''میں اَپنے رُوحانی مرشد شاعرِ مشرق ودانائے راز علامہ اقبالؔ کی چند منتخب غزلوں کی زمینوں میں طبع آزمائی کرنے کی جسارت کی ہے۔ یہ تمام مصارعِ طرح جو منسلک فہرست میں درج ہیں میرے استادِ محترم قبلہ وکعبہ ڈاکٹر امانت شیخ صاحب مدظلہ نے میری طبع سلیم کو جولاں کرنے کی غرض سے مجھے پونے سے لکھ بھیجے تھے۔ مَیں قبلہ وکعبہ

موصوف کا ممنون احسان ہوں کہ انہوں نے میری کاوشِ فکر اور طبع آزمائی پر خوشنودی کا اظہار فرمایا اور دادِ تحسین سے بھی نوازا"۔

میکشؔ کاشمیری کی ان غزلوں میں حیات و کائنات کے مسائل، جذبہ خودی کی کارفرمائی، وطنی، قومی اور ملی تصورات کے ساتھ ساتھ علامہ اقبالؔ کے محبوب علائم، تشبیہات اور استفسارات اور تراکیب کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

اقبالؔ کی شاعری میں عشق کی بڑی اہمیت ہے جس کا احساس ان کے بے شمار اَشعار سے ہوتا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

عشق کی اِک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اِس زمین و آسمان کو بیکراں سمجھا تھا میں

میکشؔ کاشمیری بھی عشق کو اہمیت دیتے ہیں۔ دیکھئے وہ اقبالؔ کی طرح عشق کا کیسے احترام کرتے ہیں اور جگہ جگہ اپنی شاعری میں اِس کی تشریح کرتے ہیں:

عشق تو ہے بے نیاز بحث و تمحیص و دلیل — تانے بانے عقل بنتی ہے دلیلوں کے مگر
مثالِ شمع ترا دل اگر گداز نہیں — رموزِ عشق کا ہوگا نہ انکشاف کبھی
ملکیتِ حُسن کی غرور نہیں — عجز پر عشق ناز کرتا ہے

عشق کے ساتھ ساتھ علامہ اقبالؔ کی شاعری میں حُسن، حیات، خودی اور دیگر کئی تصورات اہمیت کے حامل ہیں۔ میکشؔ نے بھی اپنے مرشد علامہ اقبالؔ کے اِن تصورات سے خوشہ چینی کی ہے اور اقبالؔ کا حقیقی پرستار ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

نظرؔ، بشر، فقر، شاہین، باز، کے ساتھ ساتھ خورشید، ابلیس، مژگان، شاہباز، بندہ، خدا، غازی اور انجم وغیرہ جیسے اقبالؔ کے علائم اور لفظیات کو میکشؔ نے استعمال کر کے اپنے جذبات و خیالات کو شعری پیکر عطا کئے ہیں۔ مثلاً

میکش نے اقبالؔ کی تراکیب سے بھی کام لیا ہے اور اپنی محنت، لگن اور صلاحیت سے اپنے کلام میں تازگی اور توانائی پیدا کی۔ میکشؔ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ انہوں نے ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی۔ غزل، نظم، سلام، سانیٹ، قطعہ، رباعی، دوغزلے وغیرہ ان کی پسندیدہ اصناف تھیں۔ میکشؔ قدامت پسند شاعر تھے لیکن اُن کے ہاں نیا رنگ و آہنگ بھی ملتا ہے۔ اگرچہ وہ جدیدیت کے قائل نہیں اور صرف کلاسیکی شاعری کے پرستار تھے لیکن پھر بھی اُن کے ہاں نئے نئے مضامین اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ ملتے ہیں۔ میکشؔ کا ابتدائی کلام تلف ہو گیا ہے۔ اُن کے دو[1] شعری مجموعوں بالِ ہما اور بالِ عنقا کا کلام انہوں نے صرف چار مہینوں کی مدت میں کہا ہے۔ بالِ ہما میں ایک جگہ خود ہی رقمطراز ہیں:

"اس شعری مجموعہ میں شامل سارا کلام میں نے کل چار مہینوں کی مدت کے دوران کہا ہے۔ پہلی بیاض شعر جس پر قبلہ ابوالفصاحت حضرت جوش ملسیانی صاحب نے اصلاح فرمائی تھی مستی کے عالم میں تلف کر دی تھی۔"[1]

افسوس کہ اُردو شاعری کا یہ تابندہ ستارا گزشتہ برس ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اِس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اِس طرح سے شعروادب کی دنیا میں نہ پُر ہونے والا خلاء پیدا ہو گیا۔

---

[1] ...... بالِ ہما: میکش کاشمیر۔ ص ۴۴

☆

سیّد خورشید کاظمی*

میکشؔ کاشمیری......ایک جائزہ

میکش کاشمیری ریاست جموں وکشمیر کے بالخصوص اور ملک کے بالعموم ایک ایسے معتبر شاعر تھے جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ میں نے بالخصوص اور بالعموم الفاظ بڑی ذمہ داری کے ساتھ کہے ہیں۔ میکش یقیناً زُود گو اور بسیار گو تھے۔ کہتے تھے اور خُوب کہتے تھے۔ جس طرح جوشؔ ملیح آبادی کے حضور الفاظ دست بستہ کھڑے رہتے تھے اِس اُمید کے ساتھ کہ کب ان کی قسمت کا ستارا چمک اُٹھے اور انہیں جوش اَپنے اَشعار اور نثر میں جگہ بخشیں۔ اِسی طرح میکش کی خدمت میں بھی، مجھے محسوس ہوتا ہے، بے شمار خیالات واحساسات ومشاہدات کا ایک جمِ غفیر رہتا ہوگا کہ انہیں شعر کا قالب عطا ہو۔ جب شعر کہنے کی یہ رفتار اور استطاعت ہو تو یہ سمجھ نہیں آتی کہ کیوں میکش کا کلام اخبار وجرائد کے صفحات کے ذریعے عام قاری تک نہیں پہنچا اور ملکی سطح پر ان کی وہ پذیرائی نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ بقول ان کے ؎

نہیں ہے قدرداں کوئی یہاں تیرے میکشؔ کا
وہ، جس کا نام ہے بزمِ مہ واختر میں اے ساقی

*......338، محلہ دلپتیاں۔ جموں

اسی مناسبت سے میں نے ملکی سطح پر ان کی پہچان کو بالعموم کا لفظ دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں یا تو وہ تساہل پسند تھے یا پھر انہیں رسائل و جرائد میں چھپنے کی خواہش نہ تھی۔ بقول کسے، ممکن ہے کہ میکش کسی احساس کمتری کا شکار رہے ہوں۔ لیکن اس شخص کا احساس کمتری سے کیا تعلق جس کا یہ دعویٰ ہو

میرا ہر اک شعر مے کشؔ واقعی الہام ہے
جو بھی میرا شعر ہے میں نے کہا ہوتا نہیں

جہاں تک ریاست جموں و کشمیر کا تعلّق ہے تو یہاں کا ہر صاحبِ علم، صاحبِ ذوق، سخن گو اور سخن فہم میکشؔ کے نام نامی سے اِسی طرف واقف تھا اور واقف ہے جس طرح کہ اپنی ذات سے۔ وہ ایک عرصہ دراز تک ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ رہے۔ ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ ان کے مداح لاتعداد۔ ہر اَدبی محفل میں ان کی موجودگی لازمی تھی۔ کوئی ہی ایسا مشاعرہ یا محفل شعر ہوگی جس میں میکشؔ بہ نفس نفیس شرکت فرما کر اُپنے کلام سے سننے والوں کو محظوظ نہ کرتے ہوں۔

جموں کے بہت سے شعراء کے ساتھ میرا تعارف والد محترم سید ظفرؔ کاظمی کے توسّط سے ہوا۔ وہ اِس طرح کہ جموں میں ۱۹۵۴ء سے شروع ہونے والے 'یوم حسینؑ' کے سالانہ اجلاس کے سلسلے میں مجھے اکثر ان کے پاس مصرعہ طرح لے کے جانا پڑتا تھا۔ چند بار یاد دہانی کیلئے ان کے دیدار کی سعادت بھی ملتی تھی۔ لیکن صرف میکش کاشمیری ہی ایسے شاعر تھے جنہیں میں غالباً ۱۹۵۲ء سے جانتا ہوں۔ میں اکثر ریڈیو اسٹیشن پر پہلے تو بچوں کے پروگرام میں حصہ لینے کیلئے جاتا تھا اور ان کے دیدار ہوتے تھے لیکن ان کے نام نامی سے واقفیت نہیں رکھتا تھا۔ ان سے بالمشافہ واسطہ اور گفتگو تب ہوئی جب میں پہلی بار اپنا مضمون 'اپنا اپنا ذوق اپنا اپنا شوق' ریکارڈ کروا رہا تھا۔ ان کے بار بار ٹوکنے پر بھی جب چند الفاظ کا تلفظ

صحیح طور اَدا نہ ہو سکا تو انہوں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا...... ''کاظمی صاحب کیا کر رہے ہیں آپ۔ ظفر کاظمی کے فرزند ہیں اور صحیح زبان نہیں بول سکتے۔ اسکا اثر یہ ہوا کہ ریکارڈنگ اوکے ہو گئی۔ ۱۹۷۷ء سے تو ان سے ہر اتوار کو انجمن فروغ اُردو جموں و کشمیر کی ہفتہ وار نشستوں میں مسلسل ملاقات ہونے لگی۔ انجمن کے وہ رُوحِ رواں تھے اور دوسری بار 'سنیاس' لینے سے پہلے تک وہ باقاعدہ محافل میں آتے رہے اور اپنے علم کی روشنی سے ممبران انجمن کے اَذہان کو اَدبی خوراک مہیا کرتے رہے۔

میکش کاشمیری اس ریاست کے وہ سپوت ہیں جو علم واَدب کا گہوارہ رہی ہے اور جس نے ہر زبان میں کتنے ہی نامور اور معتبر ادیب اور شاعر ادبی دنیا کو دیئے۔ شعر و شاعری کے حوالے سے ان گنت کشمیری پنڈت بھی اُردو زبان کے اَدب کو مالا مال کرنے میں پیش پیش رہے ہیں جن میں چکبستؔ، پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ، علامہ برج موہن دتاتریہ، کیفیؔ، آنند نرائین ملاؔ، تربھون ناتھ زارؔ، دینا ناتھ مستؔ، قابلِ ذکر ہیں۔ میکشؔ کے ہمعصر غیر مسلم شعراء میں منوہر لال دلؔ، نرسنگھ سہائے شوقؔ، عرش صہبائیؔ، اندر جیت لطفؔ، طالبؔ ایمن آبادی وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان تمام حضرات نے ریاست کے دوسرے بے شمار ادباء اور شعراء کے ساتھ دنیائے اُردو اَدب خاص طور پر شاعری کے گلستانوں میں وہ گل بوٹے کھلائے ہیں جن پر ریاست کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ میکشؔ ان میں سے ایک ہیں۔

میکشؔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ کچھ نظمیں بھی کہیں ہیں لیکن ان میں بھی غزل کا رنگ رُوپ بآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ وہ روائتوں اور کلاسیکی قدروں کے پرستار تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

''میرے کلام میں نیا رنگ وآہنگ قطعی نہیں ہے کیونکہ میں جدیدیت کا قائل نہیں اور صرف کلاسیکی قدروں کا ہی پرستار ہوں۔''

ڈاکٹر امانت شیخ کا کہنا ہے: "میکشؔ ایک شاعرِ خوش نوا ہیں۔۔۔۔۔ان کے کلام میں وہی رنگینی اور کیف و سرور ہے، جو حافظ و خیامؔ کا طرۂ امتیاز ہے۔"

میکشؔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، بسیار گو تھے۔ اس کے ساتھ ہی اُردو کے الفاظ پر انہیں دسترس حاصل تھی۔ اتنی کہ اکثر شاعروں میں بھی اپنا ایک شعر پڑھ کر اسے کئی بار دوسرے الفاظ استعمال کر کے پڑھتے تھے جو اس بات کا دعویٰ ہے کہ عروض و بحور سے بھی وہ کما حقہٗ واقفیت رکھتے تھے۔ شعر گوئی کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ:

"......جب شعر گوئی کی طرف طبیّعت مائل ہوتی ہے تو اشعار مجھ پر بے تھکان نازل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ شاید اِسی کو الہام کہتے ہیں اور خدائے بخشندہ کی بخشش۔"

غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں دَرجنوں شعر ہوتے ہیں اور دو غزلہ، سہ غزلہ اور پنج غزلہ کا ظہور ہوتا ہے۔ اَپنے کلام کے بارے میں وہ کتنے پُراعتماد ہیں اس کا اندازہ ان کے اِن چند اشعار سے کیجئے۔

نہ لیں امتحاں میرا اہلِ سخن
مری طبعِ موزوں بڑی تیز ہے

☆

ہم نے جو شعر کہہ دیا، آیت
کس کی جرأت جو کر سکے ترمیم

☆

مرے ذہن رسا میں شعر یوں ڈھلتا ہے میکشؔ
صدف میں جیسے بنتا ہے گوہر آہستہ آہستہ

ترا میکشؔ کوئی جواب نہیں

تو بھی معجز بیاں ہے کیسا

میکشؔ اُردو تھے، انہیں اس زبان سے عشق تھا۔ اُردو اُن کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ اُردو اُن کی زندگی تھی۔ وہ اُردو کے معلّم بھی تھے۔ کتنوں ہی کو انہوں نے اس زبان سے روشناس کرایا۔ اُن کے اس جذبۂ عشق کے چند اشعار

اِسی میں ہوگی خدا سے بھی گفتگو میکشؔ
کہ روز محشر بھی مری زباں اردو

رواں رواں مرا اردو کا نام لیتا ہے
کہ میرا جسم بھی اُردو ہے جان بھی اُردو

جو شیخ و برہمن دونوں کی جاں ہے
وہ اے میکشؔ مری اُردو زبان ہے

سب کو چاہئے اُردو میں بات چیت کریں
کہ ہر کسی کی چہیتی ہے یہ زباں یارو

میکشؔ کا کہنا ہے کہ اردو کے سلسلے میں وہ ابھی تک اپنے کو طفلِ مکتب ہی سمجھتے ہیں اور شاید اسی لئے اپنی زندگی کے ۷۳ برس گزارنے کے بعد اور دوشیزہ شاعری کی پانچ دہائیوں سے بھی زیادہ زُلفیں سنوارنے کے بعد اور شاعری میں اپنا نام پیدا کرنے کے بعد بھی انہیں ایک استاد کی ضرورت محسوس ہوئی اور انہوں نے ڈاکٹر امانت شیخ، سابقہ صدر شعبہ اردو وفارسی پونے یونیورسٹی، پونا کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور آخیر وقت تک ان کے مشوروں سے فیض یاب ہوتے رہے۔

اپنے استاد کے تئیں ان کا اظہار عقیدت ملاحظہ ہو:۔

فخر ہے میکشؔ کہ میں بھی اُن کا اَب شاگرد ہوں
مجھ پہ ہے کتنا کرم ، قبلہ امانتؔ شیخ کا
بارِ احساں سے سرِ میکشؔ ہوا جاتا ہے خم
مجھ کو بھی قبلہ امانتؔ نے سخنداں کردیا

اللہ اللہ یہ کسرِ نفسی! آج کے دور میں جب استاد و شاگرد کا تصوّر بھی نام نہاد اور خود ساختہ شعراء کے لئے حرفِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہے اور شاعری میں اس کا رواج بس نام تک رہ گیا ہے میکشؔ جیسے منجھے ہوئے اُستاد شاعر کا کسی کو اُستاد بنانا اِس بات کا ثبوت ہے کہ میکشؔ بہتر سے بہترین کی تلاش میں تھے اور یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اِنسان اپنی زندگی کی آخری سانس تک بھی مکمل نہیں ہو پاتا اور اِسے علم کی تلاش میں رہنا چاہئے۔ میکشؔ اُردو جئے اور اُردو مرے۔ ایک طرف ان کا اُردو سے یہ لگاؤ کہ وہ اِسے اپنا جسم اور جان بھی کہیں اور دُوسری طرف ان کی آخری وقت میں یہ شکایت:

"مزید کیا عرض کروں! البتہ کبھی کبھی یہ خیال مجھکو کے لگاتار رہتا ہے اور مجھے پشیمانی کا احساس بھی ہوتا ہے کہ میں نے اَپنے اظہارِ خیال کیلئے اُردو زبان ہی کو کیوں چُنا اور اِسے اَپنا اوڑھنا بچھونا بنایا جبکہ تقسیم وطن کے بعد اس کا اَب پُرسانِ حال کوئی نہیں رہا اور اس کی اَب وہ پہلی سی مان دان نہیں رہی۔"

کچھ عجیب سی لگی اور سچ جانئے مجھے دکھ بھی ہوا کہ آخر یہ احساس انہیں کیونکر ہوا کہ زبان زوال پذیر ہے۔ گو بہت سے اہلِ اُردو بھی شاید یہی احساس رکھتے ہیں لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس زبان کا ادب اتنا موثر اور دلِ کی گہرائیوں میں اُتر جانے والا ہو

وہ زبان کبھی مر نہیں سکتی۔ میکشؔ کے اپنے اشعار اِس سلسلے میں بہت ہیں جن میں سے کچھ اوپر دیئے جا چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میکشؔ کا احساس کوئی اور وجہ بھی رکھتا ہو لیکن جب تک میکشؔ کا کلام زندہ ہے اور دوسرے اُدباء اور شعراء کی تحریریں ذہنوں کو جھنجھوڑتی رہیں گی اُردو زندہ رہے گی اور انشاءاللہ ترقی کی طرف گامزن بھی۔

میکشؔ کی شاعری، کہنے والے کہتے ہیں، کئی اَدوار سے گزری ہے اور آخر تک گزرتی رہی۔ میکشؔ اپنے عروج پر تھے جب یکایک انہوں نے شاعری کو تیاگ دیا اور درس و تدریس کی طرف مائل ہو گئے۔ بقول ان کے، اس کی وجہ ان کے معنوی اور رُوحانی مرشد علامہ اقبالؔ کا یہ شعر تھا:

شاعری جزویست از پیغمبری

بارہ سال تک وہ شاعری کے تصوّر سے بھی دُور رہے بلکہ جو کچھ کہہ چکے تھے اسے بھی سمیٹ کر کسی گوشہ تاریک کے حوالے کر دیا۔ اِس سے پہلے بھی ریڈیو سٹیشن کی سروس کے دوران بقولِ صہبائی، جب اُن پر رُوحانیت کا عالم چھایا تو چند عرصہ کیلئے شعر و شاعری کے شغف سے دُور رہے تھے۔ بارہ سال کے بعد ایک حادثے نے میکشؔ کے اندر کو جھنجھوڑا اور انہوں نے خدا کی طرف سے ودیعت کردہ نعمت کا استعمال کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے طاقِ نسیاں شدہ کلام کو از سرِ نو ترتیب دیا اور انہیں دو مجموعوں 'بالِ ہما' (۱۹۹۸ء) اور 'بالِ عنقا' (۱۹۹۹ء) کی صورت میں محفوظ کر دیا۔ چند عرصہ بعد ہی وہ پھر روحانیت کی طرف راغب ہوئے اور خیال تھا کہ اب وہ واپس آنے والے نہیں کیونکہ انہوں نے اپنا نام بھی بدل لیا تھا اور چاہتے تھے کہ انہیں سوامی کیلا شانند کہا جائے۔ لیکن

چھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی

کے مصداق غالباً ایک ڈیڑھ سال پہلے وہ اپنی پرانی ڈگر کی طرف آئے۔ لیکن اُس زور وشور سے نہیں جو کہ ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ اپنے غیر مطبوعہ کلام کو وہ چھُپوانے کے حق میں نہیں تھے لیکن نہ جانے کیسے امین بنجارا نے انہیں شیشے میں اُتارا اور ان سے تمام کلام حاصل کر کے ''شہپرِ طاؤس'' (۲۰۰۶ء) کی صورت میں منظر عام پر آیا۔ ان کا چوتھا مجموعہ کلام زیرِ طباعت ہے۔

شاعر خاص طور پر وقت کا نباض ہوتا ہے۔ ہر واقعہ کو وہ بنظر غائر دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اور پھر اپنے احساسات کو شعر کی شکل میں ڈھالتا ہے۔ میکشؔ جہاندیدہ تھے۔ بھانت بھانت کے لوگوں سے واسطہ پڑا ہوگا۔ ان کے کردار وعمل کا جائزہ لیا ہوگا۔ کچھ دیکھا ہوگا، کچھ سنا ہوگا اور اُن کو اشعار کی شکل دی ہوگی۔ مطلب پرست، بیوفا، خود غرض، لوگوں، سیاست دانوں اور حکمرانوں سے ہر شاعر شاکی رہا ہے اور رہتا ہے۔ میکشؔ کے کرب کا بھی اندازہ لگایئے جب وہ کہتے ہیں:

؎ عجب جمہور کا ہے دور یارو
جدھر دیکھو ہجومِ خسرواں ہے

؎ حکمرانوں سے بھلائی کی توقع ہے فضول
بیڑیوں کے ماسوا ہم کو یہ پہنائیں گے کیا

؎ بے کسوں پر ہیں مسلط آج بھی سرمایہ دار
ان ستم رانوں کی ہم پر کب حکمرانی نہ تھی

آج کے شاعروں سے بھی میکشؔ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ خاص طور پر ان سے جو نہ تو سخن فہم ہیں اور نہ سخن شناس۔ اور جو زبردستی اپنے آپ کو صفِ شعراء میں شامل کرانے پر بضد ہوتے ہیں:

ے جن کا اُدب سے دُور کا بھی واسطہ نہیں
اُب ہیں وہی ادیب، عجب اتفاق ہے

ے سخن گوئی کا دعویٰ تھا قلم پر ناز تھا سب کو
مگر کتنے ہیں اہلِ سخن، جو اہلِ قلم نکلے

ے کس کو اے میکشؔ سناؤں جا کے میں اپنی غزل
اُٹھ گئے دنیا سے میرے ہم زبان وہم سخن

ے کیا سناؤں غزل انہیں میکشؔ
بحر کا بھی جنہیں شعور نہیں

ے تو سناتا ہے کسے میکشؔ یہ اشعار غزل
سننے والے سن کے ان کو داد دے پائیں گے کیا

اَپنے وطن اور اپنی جائے پیدائش سے کسے محبت نہیں ہوتی۔ یہ وہ جذبہ ہے جو مرتے وقت بھی انسان کے ذہن ودل میں رہتا ہے کہ اگر دَم نکلے تو اَپنے وطن میں۔ اِس محبت کو، اس جذبہ کو، اِس دلی خواہش کو غالباً کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ میکشؔ سرینگر (کشمیر) میں ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے۔ عمر کا تین چوتھائی سے بھی زیادہ عرصہ جموں میں گزارا۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ رہائش کی مناسبت سے وہ کشمیری نہیں بلکہ جموّی تھے۔ پچھلی ڈیڑھ دہائی کے کشمیر کے واقعات سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے اور بیشتر اشعار ان کے قلبی احساسات کے گواہ ہیں۔ چند شعر دیکھئے:

ے لاشیں ہیں دفن اور فضا سوگوار
جنت کہاں ہے وادیٔ سروچنار میں؟

ے پژمردہ گل ہیں سہمے ہوئے سب طیور

کشمیر جاؤں کس لئے میکشؔ بہار میں؟

جہاں میکشؔ کبھی پیدا ہوا تھا
وہ اب وادی کہاں اس کی رہی ہے

میکشؔ خستہ جاں سے بہرِ خدا
وادیٔ زعفراں کی بات نہ کر

میکشؔ روائتوں کے علمبردار تھے۔ روایتی شاعری کے پاس دار تھے۔ اس میں بھی ان کا اپنا رنگ اور اپنا انداز موجود ہے۔ کہتے ہیں:

وہ تو کہئے آگیا دل اُس پری رخسار پر
ورنہ اپنے جی میں ہرگز ہم نے یہ ٹھانی نہ تھی

بھولے نہیں وہ دن جو ترے ساتھ گزارے
زلفوں کی گھٹا یاد ہے، آنچل کی ہوا یاد
اِس طرح لیا دل کہ گماں تک نہیں گزرا
تاحشر رہے گی مجھے دلبر کی ادا یاد

نظروں سے چومتا ہوں میں روشن جبینِ یار
'کتنا حسین گناہ کئے جارہا ہوں میں'

گزارے ہیں جو میں نے ساقیِ رعنا کی محفل میں
انہی لمحوں کو اپنی زیست کا حاصل سمجھتا ہوں

میکشؔ نے حمد، نعت، منقبت اور سلام بھی کہے ہیں اور ان کا مطالعہ ان کی عقیدت کا مظہر ہے۔ جیسا کہ کہہ چکا ہوں کہ یوم حسینؑ کے سلسلے میں میکش نے کافی سلام کہے ہیں جو اپنی جگہ قابل ستائش ہیں۔ چند منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیں:

چوما جس نے پائے رسالتمآب ﷺ کو
بر سر وہ خاکِ راہ کیے جا رہا ہوں میں

ہر آیت قرآنی اِک بحرِ معانی ہے
تفسیر کریں بھی تو تفسیر نہیں بنتی

جہاں شمع روشن ہے حقانیت کی
وہاں نورِ شاہِ اُمم دیکھتے ہیں

ماسوائے حسینؑ ابن علیؓ
کوئی بھی شیرِ کربلا نہ ہُوا

میکشؔ کاشمیری کا اکثر و بیشتر کلام مطروحہ ہے۔ خاص طور پر اقبالؔ کی زمین میں انہوں نے بہت کہا ہے۔ بالِ عنقا اور شہپر طاؤس تو اقبالؔ کے مصرعوں ہی کے مرہونِ منّت ہیں۔ اِسی طرح غالبؔ سے بھی وہ رغبت رکھتے ہیں۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر میکشؔ نے اقبالؔ اور غالبؔ کی زمینوں کو ہی زیادہ اہمیت دی ہے تو میکشؔ کا اپنا وجود اور انفرادیت کہاں ہے؟ اور ان کی شاعری کو کس معیار پر پرکھا جائے؟ اِس سوال کا جواب تو مستند تنقید نگار اور اہلِ فن ہی دے سکتے ہیں۔ لیکن میرا اپنا خیال یہ ہے کہ یہ سطحی تنقید شاید صحیح نہیں ہے۔ اِس کے باوجود کہ میکشؔ نے اقبالؔ و غالبؔ یا چند دیگر شعراء کے مصارع کو بنیاد بنا کر اشعار کہے ہیں۔ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ میکشؔ نے ہر جگہ اُپنے رنگ کو قائم رکھا ہے اور اُپنی انفرادیت کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ میکشؔ کے کلام کا تجزیہ کرنے والے شاید اسے محسوس کر سکیں۔ اِسے بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اقبالؔ و غالبؔ کی زمینوں میں شعر کہنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ ایسا کرنا شاید سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہے۔ لیکن

میری نظروں میں میکشؔ اس میں کامیاب و کامران ہیں۔ میکش سے میں اور عرشؔ صہبائی ان کی بمبئی کی روانگی سے دو ہفتے قبل ان کے دولت کدہ پہ ملے تھے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی ملاقات میں ان کا کلام سننے کا اتفاق بھی ہوا اور شعر و شاعری پر بات چیت ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ وہ فروری میں آئیں گے جب ان کی کتاب شہپرِ طاؤس کی رسم اجرا ہوگی۔ وہ کیا آتے ۱۹ر جنوری ۲۰۰۶ء کی صبح کو امینؔ بنجارہ نے یہ خبر سنائی کہ میکشؔ نہیں رہے۔

آج وہ ہم میں نہیں ہیں لیکن انکی یاد اہلِ فن اور اہلِ سخن کے درمیان ہمیشہ موجود رہے گی اور ان کے مجموعہ کلام انہیں زندہ رکھیں گے۔ جیسا کہ وہ خود بھی کہتے ہیں۔

مر کر بھی مر نہیں سکتا، امر رہے گا یگوں یگوں تک
تیرا بندہ خادمِ اُردو، تیرا میکشؔ مست قلندر

اَپنی محرومی کہاں لے جاؤں!

—رُوداد نامہ—

میں نے کبھی خواب میں کشمیر نہیں دیکھا۔کبھی میں نے کشمیر خیالوں میں سفر نہیں کیا۔کبھی کسی شکارے پہ گھومنے کی آرزو نہیں جاگی۔کبھی جہلم کے پانیوں پر کوئی تحریر نہیں رکھی۔کبھی دیودار و چنار کی صفیں نہیں دیکھیں۔کبھی نرگس ونسرین ونسترن کو مس نہیں کیا۔کبھی سرمئی پہاڑوں کے ہرے دشالے نہیں دیکھے۔کبھی خلد درآغوش کو شفق زار ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔مگر اسکے باوجود بھی میں کشمیر کو اُپنے وجود کا حصہ مانتا ہوں تاہم اس خطہ کی زرخیزی سے واقف بھی ہوں اور دل میں ہر آن اسکی عظمت بھی ہے۔لیکن کبھی اس خلدِ جاوداں کو دیکھنے کا شرف حاصل نہیں ہوا اور نہ ہی کبھی دیکھنے کی خواہش ہی ہوئی۔شاید اس لئے کہ میری آنکھیں جس شہر میں اپنے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتی ہیں وہاں سہانے خواب بڑی مشکل سے آتے ہیں یا یہ کہئے کہ جاگتی آنکھوں سے دیکھے گئے خواب خواب نہیں ہوتے!

غزلوں کی نوک پلک سنوارنے کا شوق شاعر کو آوارہ بنادیتا ہے۔یہی آوارگی شاعر کو لامتناہی سفر طے کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔پھر یہی لامحدود دنیا شاعر

کے نزدیک قدرِ محدود ہو جاتی ہے۔ بیک وقت ہم ظاہری و باطنی کئی سمتوں میں سفر کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک سفر میں مری ملاقات شاعرِ قومی جناب راکیش موہن کوشک سے ہوئی۔ جنکی اَدب دوستی اور شاعر نوازی پر مجھے ناز ہے۔ انہیں کے توسّط سے میری ملاقات کرنل سنجیو کول سے ہوئی۔ کرنل صاحب کو رگوں میں خرام کرنے والا خون شاعری کو جذویت رکھتا تھا۔ اس لئے ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہونے میں وقت نہیں لگا۔

اَدبی فضا میں سانس لینے والا شاعر شعر بھلے ہی اچھے نہ کہہ پاتا ہو مگر کان آشنائی کی حد تک ہی صحیح وہ اپنے اساتذہ سے واقف ضرور ہوتا ہے۔ یوں تو میں نے راکیش صاحب کی زبانی عالی جناب میکش صاحب کی پذیرائی سُن رکھی تھی مگر کشمیر کے جن بزرگوں، اساتذہ شخصیتوں کو میں نے اُپنے بزُرگوں کے حوالے سے جانا تھا، کتابوں کے ذریعہ آشنا ہوئے تھے، ان میں جناب میکش کاشمیری صاحب میرے لئے قطعی طور سے نئے تھے اور کچھ اَپنی لاعلمی بھی تھی۔

کرنل کول صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ جب گہرے تعلق میں تبدیل ہو گیا تب انہوں نے اپنے والد ماجد میکش کاشمیری صاحب کا ذکر کیا۔ یہ خوش خبری بھی دی کہ موصوف کی بہت جلد آمد ہونے والی ہے۔ سنکر بہت خوشی ہوئی تھوڑا سا اشتیاق بھی پیدا ہوا۔ اشتیاق ہونے کی پہلی وجہ یہ تھی کہ جناب اَرضِ زعفران کے باسی تھے، دوجا یہ کہ جناب راکیش بھائی کے بزرگ تھے۔ پرچھائیوں کے شہر میں رہنے والے اس بات کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ شہرِ ناپرُساں میں کسی سے ملاقات تو کی جا سکتی ہے لیکن کسی سے ملا نہیں جا سکتا۔ وقتِ قدرتاً پابہ رکاب ہے کب کسی کی گرفت میں آیا جو میرے پاس ٹھہر جاتا۔ اپنی عدم بیزاری کہوں یا بد نصیبی

کہ میں جناب میکش صاحب سے مل نہیں سکا۔ ان کا قیام وائے قسمت آخر عمری میں میرے ہی شہر میں تھا۔ وقت نے میکش صاحب سے میری ملاقات زندگی کے بڑے عجیب موڑ پر کرائی اس وقت تک میرے دل میں موصوف کیلئے ادب واحترام کے چراغ روشن ہو گئے تھے جس کی روشنی لمحہ بہ لمحہ میرے دل کے اندھیروں کو چاک کر رہی تھیں۔ اچانک روشنی کا پھیلتا دامن سمٹنے لگا۔ میری آنکھوں میں لہولہان سورج کے غرب ہونے کا منظر تھا۔ میکش صاحب نذر آتش ہو رہے تھے۔ سب خاموش لیکن میں حیراں! اسکی قدرت کے فیصلے کو نظام دنیا سمجھ کر سارا منظر خدبہ خد صبر کے اتھاہ ساغر میں غرق ہو گیا۔ چونکہ ظاہری طور پر میری ملاقات جناب میکش صاحب سے نہیں ہوئی تھی اس لئے ان سے نہ مل پانے کا غم محض افسوس بن کے رہ گیا تھا۔ حال ہی میں کرنل صاحب نے جناب کی دو تصنیفات دیں اور ایک حکم بھی صادر کیا۔ میں نے بار ہا بال عنقا، بالِ ہما کو اپنی آنکھوں سے لگایا ہے۔

آج میں اس اُرضِ پاک میں ہوں جہاں خلد نشیں ہے۔ اس چمنستان میں تین روز کیسے گزرے پتہ نہیں چلا کئی ادیب، کئی شاعروں سے ملاقات ہوئی۔ موضوعِ گفتگو میکش صاحب ہی تھے کچھ نئی باتیں معلوم ہوئی۔ کچھ انکشافات ہوئے اب ایسے میں تم ہی کہو اے دل میں اپنی کم مائیگی کا کیا کروں۔ دل کی افسردگی کا کیا کروں۔ اس سفر کی ناکامی کا کیا کروں اُپنے اندر کی بے قراری کا کیا کروں۔

کس طرح اُپنے دل کو سمجھاؤں!

اُپنی محرومی کہاں لے جاؤں!

●

میکش کاشمیری

خادم اردو' مست قلندر [1]

''سازِ رگِ جاں'' اُردو کے ممتاز اور بزرگ شاعر پنڈت کیلاش ناتھ کول میکشؔ کاشمیری کا چوتھا شعری مجموعہ ہے۔ اِس سے قبل اُن کے تین شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''بالِ ہما'' ادارہ ماہنامہ ''تکلّم'' پونہ (مہاراشٹر) نے ۱۹۹۸ء میں شائع کیا جو اِس امر کا مظہر ہے کہ بہ حیثیت شاعر میکشؔ کاشمیری کی شخصیت مُلک گیر شہرت حاصل کر چکی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ متذکرہ بالا شعری مجموعے کو ہندوپاک کے ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ دُوسرا شعری مجموعہ ''بالِ عنقا'' ۱۹۹۹ء میں ایور گرین کمپوزرس اینڈ پبلشرز جموں کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ میکشؔ کاشمیری نے ''بالِ عنقا'' کی تمام تر غزلیات کے قصر' چونکہ علاّمہ اِقبال کی زمینوں میں تعمیر کرنے کی ایک کامیاب فنکارانہ سعی کی' اِس لیے اس مجموعے کو بھی اُمید سے بڑھ کر مقبولیت حاصل ہوئی۔ ''شہپرِ طاؤس'' موصوف کا تیسرا شعری مجموعہ ہے جو ۲۰۰۵ء میں کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز جموں کی نگرانی میں طبع ہُوا اور اِسی پبلشنگ ادارے کے اہتمام سے پیشِ نظر مجموعہ اپنے قارئین تک پہنچ رہا ہے۔ مجھے یقین کامل

ہے کہ مستقبل قریب میں بھی اُردو کے اِس قد آور، بے نیاز، صوفی صافی اور مست قلندر شاعر کی کلکِ گوہر بار اُردو کے ادبی سرمائے میں قابلِ قدر اضافے کرے گی۔ میکش کاشمیری کی شانِ بے نیازی، استغنائی، قلندری اور مستی کا ذکر یہاں مَیں نے اِس لیے کیا کہ وہ اُن حضرات کی صف میں شامل نہیں ہیں جو اَپنے ہُنر کو اَپنی خود ستائی و خود نمائی کے لیے اِستعمال کرتے ہیں اور نہ ہی اُن کا شمار ایسے فن کاروں میں ہوتا ہے جو دولت، شہرت اور مادّی وسائل کے حصول کے لیے اپنی زبان اور اَپنے فن کو وسیلے کے طور پر برتنے کے قائل ہیں۔

اکثر اُردو زبان و اَدب کے مطالعے کے دوران میں، بلکہ زِندگی کے دُوسرے شعبوں میں بھی، یہ بات مَیں نے محسوس کی ہے، اور بڑی شدّت سے محسوس کی ہے کہ کچھ لوگ کام کم کرتے ہیں لیکن نام زیادہ کما لیتے ہیں۔ کچھ لوگ کام بہت زیادہ کرتے ہیں مگر اُن کا نام نہیں ہوتا یا پھر بہت کم ہوتا ہے۔ ناموری اور گمنامی یا کم نامی کے اِس کھیل میں کام کے معیار اور مقدار کا ایک اہم رول ہے لیکن اِس حقیقت سے بھی اِنکار نہیں کیا جا سکتا کہ اِن دونوں خصوصیات کے علاوہ چند عناصر اور بھی ہیں جن کے صحیح اِستعمال کا گُر جاننے والے معیار اور مقدار کے فُقدان کے باوجود ''شمعِ محفل'' اور ''امیرِ کارواں'' بننے ہیں، کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اب وہ عناصر کون سے ہیں، اُن کے صَحیح اِستعمال کے داؤ پیچ کس مدرسے میں سکھائے جاتے ہیں، مَیں بذاتِ خود کتنے ''خود ساختہ امیروں'' کو جانتا ہوں اور ''مانگے کا اُجالا'' لیے ہوئے کتنی ''شمعیں'' میری نگاہوں کے سامنے ٹمٹما رہی ہیں، اِن تمام سوالوں کا جواب بکھیڑے بازی کی جڑ ثابت ہو گا اِس لیے مجھے یہاں اِس سے اجتناب برتنا چاہیے۔ ایسی بھی کئی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ کام

کرنے والوں کے ہاں معیار ہے، مقدار ہے اور دولت، شہرت اور عزت کی بُلندیوں کو بھی وہ چھو رہے ہیں لیکن پھر بھی رو رہے ہیں کہ زمانہ اُن کی ناقدری کر رہا ہے۔ اَب ایسے لوگوں کو کون سمجھائے کہ زمانہ اُن کا ناقدر نہیں ہے بلکہ اُن کی ناشکوری، ناصبوری، حرص و ہوس، طمع، لالچ اور تشنگی جیسے عوامل کے جال میں اُن کی محصوری نے اُنھیں خود ہی اپنی ذات کا ناقدر بنا رکھا ہے۔ ایسے بے چین اور بے کل دوستوں کی آدھی اُدھوری فہرست بھی میرے سامنے ہے لیکن مَیں اُن کے ذِکر اور اُن کی دِلی کیفیات کے بیان کو بھی انسب نہیں سمجھتا کیونکہ میرے قریب یہ عمل توضیعِ اوقات سے زیادہ کُچھ نہیں۔ مَیں تو یہاں میکشؔ کاشمیری کے ذِکر پر اپنی توجہ مرکوز کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اپنی فکرِ رسا سے زِندگی کو بہت کچھ دیا لیکن زندگی سے مانگا کُچھ نہیں۔ جنھوں نے معاشرے کی جھولی اپنے اعمال و افعال اور اقوال کے بیش قیمت موتیوں سے لبریز کر دی لیکن معاشرے سے اُس کا صِلہ طلب نہیں کیا۔ جو کسی قسم کا بھاؤ تاؤ کیے بغیر اُپنے دردمند دِل، روشن دِماغ اور بالیدہ ذِہن کی حصولیابیوں سے مزیّن سہرے کی لڑیوں کو سوسائٹی کے ماتھے پر سجا کر اُس کے چہرے پر موجود بے راہ روی کے بدنُما داغ چھپانے میں مصروف ہیں۔ مَیں تو اُس بے لوث اور نیک شخصیت کے بارے میں چند سطریں لکھنا چاہتا ہوں کہ یہ وقت کا صحیح تصرّف بھی ہے اور فرض بھی۔

میکشؔ کاشمیری ایسے سخن سنج ہیں جو شاعری کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں اور اِس جہانِ فانی کو کرم بھومی تسلیم کرتے ہوئے صحیح معنوں میں ایک کرم یوگی کا کردار اَدا کر رہے ہیں۔ کسی صِلے، ستائش، ایوارڈ یا اعزاز کی پروا کیے بغیر وہ اُردو زبان و ادب کی آبیاری میں مصروفِ کار ہیں۔

اِسی میں ہو گی خُدا سے بھی گفتگو میکشؔ

کہ روزِ حشر بھی ہوگی مری زباں اُردو

میکشؔ کاشمیری کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُردو کے مقتدر اُدباء، شعراء اور محققین و ناقدین اُن کے فن کا لوہا تسلیم کر چکے ہیں۔ آبروئے ادب پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ نے میکشؔ کاشمیری کو جہاں "قادرالکلام شاعر"، "ایک انجمن" اور "ایک ادارہ" قرار دیا ہے[۲] وہیں پروفیسر شمیم حنفی نے موصوف کے "متصوّفانہ تجربوں" کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے اُنھیں "کشادہ فکر" اور "جرأتِ اظہار" کا شاعر تسلیم کیا ہے۔[۳] میکشؔ کاشمیری کے فن پر اپنی آراء کا اِظہار کرتے ہوئے اُردو و فارسی کے معروف ادیب، محقق اور شاعر ڈاکٹر امانتؔ شیخ لکھتے ہیں:

"......شعورِ شاعری خُدا کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے۔ میکشؔ بھی اشعار یا غزلوں کو خُدا ہی کی دین سمجھتے ہیں جو اُن پر غیب سے بصورتِ الہام نازل ہوتی ہیں۔ وہ اپنی غزلوں کو رنگین و پُر کار اور پُرسوز بناتے ہیں، جنھیں خونِ جگر سے سینچنا پڑتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

شعورِ شاعری تُو نے ہی بخشا ہے اگر مجھ کو

تو پھر غزلوں میں یہ حُسنِ بیاں تیرا ہے یا میرا؟

ڈاکٹر امانتؔ مزید لکھتے ہیں:

"....غزل سے میکشؔ صاحب کو والہانہ عشق ہے۔ وہ بسترِ مرگ پر بھی اپنی ادھوری غزل کو مکمل کرنے کے خواہاں ہیں۔ وہ اجل کو لبیک تو کہتے ہیں

مگر اِس شرط پر کہ اُن کی تازہ غزل مکمل ہو جائے
اور وہ اُس کی نوک پلک کو اچھی طرح سنوار
لیں۔ اُن کا قطعہ ملاحظہ فرمائیے ؎

تُو جو آئی ہے تو چل حاضر ہُوں اے میری اجل!
ہاں ذرا کر لُوں مکمل اپنی یہ تازہ غزل

ایک موزُوں و مُناسب لفظ بس درکار ہے
ورنہ تجھ سے کب مَیں کرتا ہُوں کوئی لیت ولعل؟

اُردو زبان و ادب کی اِن یکتائے روزگار شخصیات کے وقیع خیالات پیش کرنے کے بعد مَیں آخر میں یہی کہوں گا کہ کلامِ میکشؔ فن، تکنیک، اسلُوبِ بیاں اور موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے متعدد اوصاف کا حامل ہے۔ یہ خوبی بھی قابلِ غور ہے کہ اُن کے ہاں معاشرے کا درد و کرب اُن کے اپنے درد و کرب میں ضم ہوتا نظر آتا ہے اور وہ اِس اجتماعی درد سے کلبلانے کے بجائے اکسیر گری کی سعی کرتے ہیں۔ خود کو ابوالفصاحت جوشؔ ملسیانی اور ڈاکٹر امانت شیخؔ کی خاکِ پا کہہ کے فخر محسوس کرنے اور اُستاد شاگردی کی دم توڑتی ہوئی روایت کو حیاتِ نو بخشنے والے اُردو کے کشمیری نژاد شاعر میکشؔ کاشمیری اَسّی بیاسی برس کی عمر میں بھی ''سازِ رگِ جاں'' کا ایک ایک تار چھیڑ کر جس فنکارانہ مہارت کے ساتھ شاعری کے آرٹ کو بلندیوں کی طرف لے جا رہے ہیں اور جس بے غرض، بے لوث اور مُخلصانہ جذبے کے تحت اُردو زبان کے فروغ اور تحفظ کے لیے کوشاں ہیں، اِس کے لیے اُنھی کا ایک شعر خراجِ تحسین کے طور پر اُن کی خدمت میں پیش کر رہا ہُوں ؎

مَر کر بھی اب مَر نہیں سکتا، اَمر رہے گا یگوں یگوں تک
تیرا بندہ خادمِ اُردو، تیرا میکشؔ، مست قلندر

حواشی اور حوالے

۱ ...... آنجہانی میکش کاشمیری صاحب کے چوتھے شعری مجموعے ''سازِ رگِ جاں'' کا دیباچہ، جسے موصوف کے پیہم اِصرار پر راقم نے لکھا۔ میکش چاہتے تھے کہ اُن کے شعری مجموعوں ''شہپرِ طاؤس'' اور ''سازِ رگِ جاں'' دونوں کے لیے دیباچہ مَیں لکھوں اور میں چاہتا تھا کہ اپنی کتب کے لیے دیباچہ، تقریظ یا مُقدمہ، وہ کسی بڑے شاعر یا ناقد سے لکھوائیں لیکن وہ نہیں مانے، بڑی ضدی طبیعت کے تھے۔ تھک ہار کر مَیں نے میکش صاحب کے سامنے دو شرطیں رکھیں۔ ایک یہ کہ ایک کتاب کا حرفِ اوّل بعنوان ''اپنی بات'' وہ خود لکھیں اور دُوسری کتاب کے لیے مَیں اپنے تاثرات قلم بند کر دیتا ہوں۔ میری دُوسری شرط یہ تھی کہ میرے مضمون پر ''دیباچہ'' نہیں لکھا جائے گا بلکہ میرے دئے ہوئے عنوان کے تحت ہی اسے شاملِ کتاب کیا جائے۔ میکش راضی ہو گئے۔ ''شہپرِ طاؤس'' کیلئے اُنھوں نے ایک طویل مضمون لکھا، جس کا نصف حصّہ ہی کتاب میں شامل کیا جا سکا۔ اُن کا لکھا ہُوا مکمل مضمون شاملِ کتاب کیوں نہ ہو سکا، یہ سوال پھر کسی وقت زیرِ بحث لانے کی سعی کروں گا۔ ''سازِ رگِ جاں'' کیلئے مورخہ ۱۲ر جنوری ۲۰۰۶ء کو مَیں نے یہ مختصر سا مضمون لکھا۔ مَیں اِسے صاف کر کے ایک کاپی بذریعہ ڈاک ممبئی بھیجنا چاہتا تھا، جہاں میکش اپنے صاحبزادے کرنل (ریٹائرڈ) سنجیو کول کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ مُیں مکروہاتِ دُنیوی میں ایسا اُلجھا کہ مضمون صاف کر سکا نہ میکش کو بھیج سکا۔ اور قبل اِس کے کہ مَیں یہ سب کر پاتا، میکش اِس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

۲ ...... پروفیسر جگن ناتھ آزاد ''تعارف'' مشمولہ ''بالِ ہُما''، سن اشاعت ۱۹۹۸ء

۳ ...... پروفیسر شمیم حنفی ''حرفے چند'' مشمولہ ''بالِ ہُما''، سنِ اشاعت ۱۹۹۸ء

۴ ...... ڈاکٹر امانت شیخ ''میکش کاشمیری: بالِ عنقا کی روشنی میں'' مشمولہ ''بالِ عنقا''، سنِ اشاعت ۱۹۹۹ء۔

۵ ...... ڈاکٹر امانت شیخ ''بالِ ہما: میری نظر میں'' مشمولہ ''بالِ ہُما''، سن اشاعت ۱۹۹۸ء

میکشؔ کاشمیری "شہپرِ طاؤس" کے آئینے میں

یہ سال ۱۹۷۹ء کے موسمِ بہار کی بات ہے جب مجھے ریڈیو کشمیر جموں میں آنجہانی کیلاش ناتھ کول میکشؔ کاشمیری سے پہلی بار ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اُس وقت آپ وہاں اُردو اور کشمیری پروگرام کے اِنچارج تھے۔ میرے استادِ محترم جناب منشورؔ بانہالی نے مجھے اُن سے متعارف کروایا اور انہوں نے اپنی اوّلین فرصت میں میری دو کشمیری غزلیں ریکارڈ کر لیں۔ بعد ازاں وہ مجھے بار بار دعوت دیتے رہے اور ہماری قربت میں نمایاں اضافہ ہوتا رہا۔ اُن کے اوصافِ حمیدہ میں بلند اِخلاقی سب سے بڑی صفت تھی جس کا میں ہمیشہ پاسدار رہا ہوں۔ اُن کی چال ڈھال، قد و قامت اور پوشاک بالکل مختلف و منفرد تھی۔ دُور سے وہ ایک بڑے مولانا دکھائی دیتے۔ نزدیک جائیں تو کسی مَست قلندر سے کم نہ تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ہمارا رابطہ منقطع ہو گیا۔ ایک روز اُن کے شاگردِ عزیز جناب تنویرؔ بھدرواہی صاحب کی تصنیف 'پرتوِ تنویرؔ' کا مطالعہ کرتے کرتے معلوم ہوا کہ میکشؔ نے اپنا سارا کلام جذبات میں آکر ضائع کر دیا ہے۔ مجھے اِس بیش قیمت کلام کے نیست و نابود ہونے کا بہت دُکھ ہوا لیکن ایک دن وہ بھی آیا جب

ان کا پہلا شعری مجموعہ 'بالِ ہما' انجمنِ فروغِ اردو جموں کے زیرِ اہتمام ایک تقریب میں ریلیز ہوا۔ میکش نے تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ 'بالِ ہما' کے تمام نسخے اُردو شعر و اَدب کے پروانوں کیلئے مفت فراہم کئے جائیں گے۔ انہوں نے مجھے بھی 'بالِ ہما' عطا کی اور اِس کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ جوشؔ ملسیانی کے اس مایا ناز شاگرد نے سچ مچ کافی دیر تک کوئی شاعری نہیں کی۔ مگر بعد میں 'بالِ ہما' کا سارا کلام کُل چار مہینوں کی مدت کے دَوران کہا تھا۔ وہ اپنا کلام مسلسل بذریعہ ڈاک ڈاکٹر امانت شیخ، سابق صدر شعبہ اُردو و فارسی پُونے یونیورسٹی کو اَرسال کرتے رہے۔ جن کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہونے پر میکش کافی فخر محسوس کرتے تھے۔ ۱۹۹۸ء میں بالِ ہما اشاعت پذیر ہوئی جبکہ ایک ہی برس کے بعد دُوسرا شعری مجموعہ 'بالِ عنقا' کے نام سے شائع ہوکر پریس کلب آف جموں میں جموں و کشمیر اُردو فورم جموں کی جانب سے منعقدہ ایک شاندار تقریب میں ریلیز کیا گیا۔ اِس وقت ہم میکشؔ کے تیسرے مجموعے یعنی شہپرِ طاؤس کی رسمِ رُونمائی میں شامل ہوئے ہیں مگر حیف کہ خادمِ اُردو اور مُصنّف شہپرِ طاؤس خود اَب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ اُنہوں نے خود فرمایا ہے کہ۔

جگر کے خون سے سینچا ہے اُن کو اے میکشؔ
یہ غزلیات ہیں یارانِ نکتہ داں کیلئے
میرا ہر ایک شعر ہے کشِ واقعی الہام ہے
جو بھی میرا شعر ہے میں نے کہا' ہوتا نہیں

میکشؔ ملک کے سَربرآوردہ روایت پسند اُردو شاعر تھے۔ آپ کو اقبالؔ، چکبستؔ، رتن ناتھ سرشارؔ، آنند نرائن مُلاؔ وغیرہ چوٹی کے قلمکاروں کی طرح اَپنے

کشمیری نژاد ہونے پر فخر تھا جنہوں نے بقول آزاد سارے ہندوستانی اَدب اور ہندوستانی تہذیب وتمدن کا دامن بھر دیا ہے۔ علامہ اقبال اور اُن کی شاعری سے میکش صاحب کو پرستش کی حد تک عقیدت تھی۔ میکش صاحب نے اقبال کی بالِ جبریل کی تقلید میں اَپنے مجموعہ کلام کیلیئے بالِ ہما عنوان پسند کیا اور علامہ ہی کے شعر سے اَپنے دوسرے شعری مجموعے کا نام بالِ عنقا رکھا۔ بالِ ہما چار حصوں پر مشتمل ہے، غزلیات، دوغزلے، منظومات اور رُباعیات وقطعات۔ امانت صاحب کے مطابق غزل سے میکش کو والہانہ عشق تھا۔ وہ بسترِ مرگ پر بھی ادُھوری غزل کو مکمل کر لینے کے خواہاں تھے۔ وہ دُنیا بھر کے اِنسانوں کو دَرسِ مَساوات دیتے اور ایک ہی گلشن کے طیور خوش الحان تصوّر کرتا تھا۔ الغرض بالِ ہما شاعری کا ایک عمدہ نمونہ ہے جس کی بدولت میکش کا نام ہمیشہ کیلیئے زندہ ہوگیا ہے۔ جناب شمیم حنفی صاحب نے لکھا ہے کہ میکش کاشمیری اُردو کلچر کی اُس روایت کے پاسبانوں میں سے تھے جو رفتہ رفتہ سمٹتی جارہی ہے۔ اُردو اُن کا عشق بھی تھا اور اُن کا سپاسنامہ بھی۔ اُن کی شاعری کے آہنگ اور مزاج پر اُردو کے ٹھیٹھ لہجے کا جو اثر، جو بے تکلفی اور سادگی دکھائی دیتی ہے وہ اُردو کے بنیادی مزاج سے اُن کی ایسی واقفیت کے علاوہ جوش ملسیانی کی تربیت کا نتیجہ بھی ہوسکتی ہے۔ بالِ ہما کے چند اشعار اِس طرح ہیں۔

شاعری میری زندہ جاوید ۔۔۔ جو بیک وقت ہے جدید وقدیم
میرا عزم بلند کوہ شکن ۔۔۔ میرے اَفکار رشکِ عرشِ عظیم

جو شیخ وبرہمن دونوں کی جاں ہے ۔۔۔ وہ اَے میکش مری اُردو زبان ہے

اُگتے ہیں جس میں نرگس، ونسرین ونسترن
میکش بھی ایک پھول اُسی گُل زمین کا ہے

مرے ذہنِ رسا میں شعر یوں ڈھلتا ہے اے میکشؔ

صدف میں جیسے بنتا ہے گہرا آہستہ آہستہ

بالِ عنقا' میکشؔ کاشمیری کا دوسرا مجموعہ کلام ہے۔ اِس مجموعہ کلام میں شامل تمام غزلیں اقبالؔ کی زمینوں میں ہیں۔ میکشؔ صاحب نے اقبالؔ صاحب سے جو والہانہ عقیدت دکھائی ہے وہ ایک عالی ہمت شاعر ہی کا کام ہے۔ وہ اگر علامہؒ اقبالؔ کا معنوی اور رُوحانی شاگرد ہونے کا دعویٰ کرتے تھے تو وہ بجا تھا۔ اُن کی عقیدت کا بَرملا اظہار بالِ عنقا کے لفظ لفظ بلکہ حرف حرف سے ظاہر ہے۔ اِس شعری مجموعے پر رائے زنی کرتے ہوئے ماہرِ اقبالیات پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ صاحب نے تحریر کیا ہے کہ...... "میکشؔ کاشمیری ایک دِلکش شخصیت کے مالک ہیں اور یہ دلکشی اُن کی شاعری میں بھی بدرجہ اتم نظر آتی ہے۔ اُن کے کلام میں کشمیر کا حسن جابجا اپنے جلوے بکھیرتا دکھائی دیتا ہے۔ میکشؔ اگر اَپنے آپ کو علامہؒ اقبالؔ کا معنوی اور رُوحانی شاگرد کہتے ہیں' تو غلط نہیں کہتے۔ میرا خیال ہے کہ اِس مجموعہ کلام کی اِشاعت کے بعد وہ اِسی کنیت اور اِسی لقب سے جانے جائیں گے"۔ بالِ عنقا کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

غزل تیری رنگین وپُر کار کیا تھی؟ سبھی پر تھا اک عالمِ وجد میکشؔ

☆

ہر غزل مری ہے عکسِ گلفام ابھی غیب سے ہوتا ہے الہام اے میکشؔ اَب بھی

☆

نہ جانے کیوں قلم رُک رُک کے چلتا ہے مرا میکشؔ

دِلی جذبات کی کرتا ہوں میں جب بھی قلم بندی

مثلِ شاہین جو بلند اُپنی نظر نہ کرسکا مورِ بے مایہ کی مانند رہیگا پامال
اُڑان تری اگر مثلِ شاہباز نہیں ترے نصیب میں یہ وسعتیں فلک کی کہاں

بالِ عنقا پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے نامور افسانہ نگار، ادیب اور ناقد جناب امین بنجارا صاحب لکھتے ہیں کہ ''شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کی زمینوں میں کہی ہوئی اِن غزلوں میں سادگی وسلاست بھی ہے اور اثر آفرینی بھی۔ بیان کا لطف اور اسلوب کی خوبیاں واضح طور پر نمایاں ہیں۔ کلاسیکی کے علمبردار میکش صاحب نے غزل کی روایات کی پابندی کرتے ہوئے اپنی قلندری اور استغنائی کے جلوے بھی جابجا بکھیرے ہیں۔ میکش علامہ اقبال کے بعد اُردو کے جس دوسرے شاعر کے زیادہ قریب نظر آتے ہیں وہ مرزا غالب ہیں۔''

میکش کا تیسرا مجموعہ کلام 'شہپرِ طاؤس' بھی اُن کے متذکرہ بالا دو مجموعوں کی طرح بڑے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ مختار گرافکس' جموں کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز جموں اور برادر امین بنجارا نے اس تصنیف کو خوبصورت اور خوشنما بنانے میں اچھی خاصی دلچسپی دکھائی ہے۔ سرورق دِلکش و دِلربا ہے اور میکش صاحب کے یہ دو شعر سُرخی بن کر اِس کتاب کے حُسن کو دوبالا کرتے ہیں۔

ذہن ودل میں تھے جو مرے محبوس اُن خیالوں کو کردیا آزاد
پیش کرتا ہوں 'شہپرِ طاؤس' اَب ہیں قرطاس پر یہ سب رقصاں

کتاب کی پُشت پر چھپی ہوئی مصنّف کی تصویر آج کی اِس رسم رونمائی کا جیسے مشاہدہ کررہی ہے۔ میکش صاحب کی متانت وسنجیدگی کے ساتھ ساتھ اُن کی نرالی مسکراہٹ غور طلب ہے۔ تصویر کے نیچے خادم اُردو کا یہ دل پذیر شعر قاری کو دعوتِ غور وفکر دیتا ہے۔

حلاوت کیوں نہ ہو اِس میں، سلاست کیوں نہ اِس میں؟

ڈھلی ہے یہ مری اُردو زباں کوثر میں اے ساقی!

۱۲۸ صفحات پر چھپی ہوئی شہپرِ طاؤس کا انتساب میکشؔ کاشمیری نے اپنی عزیز از جان دختر ارجمند و فرخندہ اختر شریمتی وجے لکشمی زتشی کے نام کیا ہے جو ۵/اگست ۲۰۰۵ء کو انہیں داغِ مفارت دے کر واصل بحقِ ہوئی تھیں۔ انتساب کو مؤثر بنانے کیلئے یہ شعر وجے لکشمی کی تصویر کے اُوپر اور نیچے درج کئے گئے ہیں۔

کل تک جو روبرو تھی وہ رُوپوش آج ہے ہم سے جو ہمکلام تھی خاموش آج ہے

☆

رہ گیا تیرا افسانہ بعدِ مرگ ذکر ہے خانہ بخانہ بعدِ مرگ

اے وجے زتشی! میری بیٹی! تجھے یاد کرتا ہے زمانہ بعدِ مرگ

'شہپرِ طاؤس' کی اشاعت میں دستِ تعاون پیش کرنے والوں میں امین بنجارا، صدر پروفیسر جگن ناتھ آزاد فاؤنڈیشن جموں اور کرنل سنجیو کول فرزند ارجمند و دلبند میکشؔ کا خصوصی طور پر اظہار تشکر کیا گیا ہے۔ حرفِ اوّل میں میکشؔ صاحب لکھتے ہیں...... ''میرا یہ تیسرا شعری مجموعہ 'شہپرِ طاؤس' کے عنوان سے پیشِ خدمت ہے۔ اِس مجموعے میں منظومات کے علاوہ بیشتر مطروحہ غزلیں ہیں اور وہ بھی دو غزلے اور سہ غزلے، نیز ایک پنج غزلہ بھی شامل ہے۔ تخلص کے اِس شاہکار پر خدائے سخن کا بے پایاں کرم ہے۔ تسلیم کہ میں زود گو ہوں اور بسیار گو بھی مگر اِس کو کیا کیجئے کہ جب شعر گوئی کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہے تو اشعار مجھ پر بے تکاں نازل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ شاید اِسی کو الہام کہتے ہیں اور خدائے بخشندہ کی بخشش۔ میری اِن غزلیات کا طویل ہونا میری طبع آزمائی اور مشق و مزاولت پر

مشتمل ہے۔ جنتِ کشمیر میرا جنم استھان ہے۔ ذات سے کشمیری النسل برہمن ہوں مگر میں ذات پات، چھوت چھات، بھید بھاؤ، تعصب اور تنگ نظری میں قطعاً یقین نہیں رکھتا۔ والدِ بزرگوار کی طرح وحدت الوجود میرا بھی نظریہ ہے۔ ''ہمہ اوست اور واحدہٗ لاشریک ہو حرزِ جاں''۔ صوفیائے کرام کے ارشادات اور فرمودات عالیہ پر حتی الامکان کاربند رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔

جہاں ہوں اب میں بہ فیضِ مرشد | یہ رنگ و بُو کا جہاں کہاں ہے
وہاں تو میں یا مرا خدا ہے | یہ بزمِ کون. ومکاں کہاں ہے؟

☆

جہاں ہے مست الست مے کش! | اُسے ہے کیفِ دوام حاصل
وہاں یہ صہبا، یہ جام ومینا | یہ بزمِ پیرِ مغاں کہاں ہے؟

میکش کاشمیری کے اپنے حرفِ اوّل کے بعد شہپرِ طاؤس کے شروع میں کُل نو اشعار پر مشتمل ایک حمد پڑھنے کو ملتی ہے۔ یہاں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ میکش قرآن کریم کی متواتر تلاوت کیا کرتے تھے۔ مذہبِ اسلام سے متعلق اُن کی جانکاری بھی کافی اچھی تھی۔ اُن کے اِن حمدیہ اشعار سے اُن کے وسیع مطالعے کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

رہتے ہیں تیری یاد میں برگ و شجر مدام | تیری ثنا میں محوِ زبانِ طیور ہے
آتا نہیں نظر مجھے کوئی ترے سوا | جس سمت دیکھتا ہوں ترا ہی ظہور ہے
دِل میں ہے تیری یاد، زباں پر ہے تیرا نام | آنکھوں کی پتلیوں میں بھی تیرا ہی نُور ہے
بندے کی گر خطا ہے کوئی تو معاف کر | شانِ عفو دِکھا کہ تو ربِ غفور ہے

میکش ایک مخصوص انداز میں حمدِ باری تعالیٰ پیش کرنے کے بعد تعارف

کے زیرِ عنوان اُپنے آپ کو سفیر عالم بالا قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں

جہاں میں ہوں ، وہاں ہفت آسماں ہیں
فضا ئیں کہکشاں در کہکشاں ہیں
اَندھیرے کا نہیں نام ونشان تک
وہاں تو نُور کے دریا رواں ہیں
سفیرِ عالم بالا ہوں میکشؔ
بناتُ النعش میری بیٹیاں ہیں

شہپرِ طاؤس میں تیرہ دوغزلے، دو مطروحہ سہ غزلہ اور ایک مطروحہ پنج غزلہ ہیں۔ اِس طرح کُل مِلا کر غزلیات کی تعداد ۳۸ ہو جاتی ہے۔ طرحِ مصرع غالب، جگرؔ مرادآبادی، داغ دہلوی، خمارؔ بارہ بنکوی، بہادر شاہ ظفر وغیرہ کے کلام بابلاغت سے اخذ کیے ہیں۔ اچھی بنیادوں پر اچھی شاعری کی گئی ہے۔ جس میں فنّی نزاکت اور چابکدستی لفظ لفظ سے ظاہر ہے۔ اِن شعروں کو پڑھ کر میکشؔ کاشمیری کی شاعرانہ عظمت اور غزل سے دِلی رغبت کا اعتراف ہوتا ہے۔ آپ روایت پسند تو تھے ہی لیکن آپ کی شاعری میں جدّت کا بہترین امتزاج بھی موجود ہے۔ میکشؔ اُردو غزل کے مزاج سے نہ صرف بخوبی آشنا تھے بلکہ اُن کی طبیعّت کو غزل گوئی سے کافی مناسبت تھی۔ دریائے جہلم اور دریائے چناب کے ماخذ تو سوکھ سکتے لیکن میکش کی غزل کے ماخذ اُن کی موت تک جاری رہے۔ زود گوئی انہیں پسند تھی مگر طوالت اُن کی شاعری کے معیار کو کسی بھی قسم کی آنچ نہیں آنے دیتی۔ ہمالیہ کے چشموں کی طرح میکشؔ کی شاعری کے چشمے بھی تا دمِ آخر پوری آب وتاب کے ساتھ پھوٹتے رہے۔ میکش کی غزلیات میں الفاظ کی چست بندش، زبان کی روانی اور خیالات کی

بلندی اُن کی استادانہ مہارت کی روشن دلیل ہیں۔ ان کی غزلوں کے مختلف پہلوؤں کا اندازہ مندرجہ ذیل شعروں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے ۔

یہاں کیوں روزِ روشن ہی میں قتل عام ہوتا ہے
بپا ہنگامہ ہے ہر روز کیوں گھر گھر میں اَے ساقی!

☆

کسی کا چھیننا دل توڑ دینا اُس کا شیوہ ہے
اَدائے دِلدہی کب ہے کسی دلبر میں اے ساقی!

☆

سنبھلئے حضرتِ واعظ! ادھر ہے میخانہ
کدھر کا عزم ہے شب کو عصا لئے صاحب؟

☆

کوئی بھی اسکا خریدار اَب نہیں ملتا
بھٹک رہا ہوں میں جنس وفا لئے صاحب!

☆

یہ نوجوان بڑے منچلے ہیں بچئے گا
عمامہ اپنا ہمیشہ سنبھالئے صاحب

☆

گلے لگا کے یتیموں کو مجھ سے عاصی نے
ثواب جتنے تھے سارے کما لئے صاحب!

☆

یار روٹھے ، کوئی منا بھی لے
بخت روٹھے تو کیا کرے کوئی ؟

کوئی پروانہ بن کے جلتا ہے
شمع بن کر جلا کرے کوئی

حسن کی سمت کھینچ گئے میکشؔ
دل نہ مانے تو کیا کرے کوئی ؟

☆

قوم سے کھلواڑ کرتے آئے ہیں فرماں رَوا
کون سی کرتوت ان کی غیر انسانی نہ تھی ؟

کیوں یہ قسمیں؟ سانچ کو تو آنچ ہوتی ہی نہیں
تم اگر سچّے تھے تو جھوٹی قسم کھانی نہ تھی

وادی کشمیر میں برپا شورش اور کشمیری پنڈتوں کی وسیع پیمانے پر نقل مکانی سے میکشؔ کافی پریشان تھے۔ کشمیر سے اُن کے لگاؤ کا ٹھیک ٹھیک اندازہ اِن اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔

زُنار پوش جتنے تھے اے مالکِ جہاں
کیوں بے دیار ہوگئے اُپنے دیار میں

لاشیں ہیں دفن اور فضا سوگوار ہے
جنتؔ کہاں ہے وادیٔ سرور چنار میں؟

پژمُردہ گل ہیں، سہمے ہوئے سب طیور ہیں
کشمیر جاؤں کس لئے میکشؔ بہار میں؟

میکش کو مستورات کی عریانی اور فیشن پرستی چنداں پسند نہ تھی۔ مثلاً یہ شعر

زلفیں بھی بریدہ ہیں، سراپا بھی ہے عریاں
اِس دور کی مریم کو نہیں شرم و حیا یاد

منظومات کے حصّے میں شہیدانِ کرگل کو سلام، جنگ و امن، ادھر بھی ہیں، ادھر بھی، سوالات، شکوہ اللہ سے، اُردو کی فریاد و فغاں، سچّے پاتشاہ شری گورونا نک دیو جی، سکوتِ شب، زہرہ جبیں، مطروحہ سلام حسینؓ، آہ عابد پشاوری اور خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زبان میری، قافیہ بند اور طویل نظمیں ہیں۔ غزل کی طرح میکش نظم گوئی کے فن پر بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔ صاف ہشتہ اور سادہ الفاظ میں انہوں نے خوبصورت انداز میں نظمیں کہی ہیں۔ مضمون آفرینی اور قلم کی روانی قابلِ توجّہ ہے۔ اُردو کی حالت زار پر کفِ افسوس ملتے ہوئے شاعر موصوف نے فرمایا ہے۔

ملک کی میراث ہے اے دوستو! اردو زبان
جنگ آزادی میں اِس کا رول ہے سب پر عیاں
سب نے اِس کو سینچا ہے اُپنے جگر کے خون سے
لہلہاتا تھا کبھی اُردو زباں کا گلستاں
اس پہ تقسیم وطن کی بجلیاں ایسی گریں
خاک برسر آج ہے یہ نازشِ ہندوستان
حاکمانِ وقت سے میکش کا ہے اتنا سوال
کیا نہیں یہ ہندو و مسلم کی مشترکہ زبان

محسنِ اُردو پنڈت کیلاش ناتھ کول جو اُدبی حلقوں میں میکش کاشمیری کے نام سے دُور دُور تک مشہور ہو گئے، پنڈت جیون ناتھ کول کے گھر ۱۷ر جولائی ۱۹۲۶ء

کو بمقام ہفت چنار سرینگر (کشمیر) تولّد ہوئے۔ آپ بی اے، منشی فاضل، ایم اے انگریزی تھے۔ ریڈیو کشمیر سرینگر اور جموں میں بحیثیتِ پروگرام اسسٹنٹ اور اسسٹنٹ ایڈیٹر شعبہ اردو ۳۴ سال تک ملازمت کرتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بارہ سال دیوان بدری ناتھ سکول جموں میں بطور سینئر انگلش ٹیچر کام کیا۔ آپ ۱۹ر جنوری ۲۰۰۶ء کو ممبئی میں اِنتقال کر گئے۔ اُن کی وفات سے اُردو شعر و اَدب کو ناقابلِ بیان نقصان ہو گیا۔ علم و اَدب کے پرستار کفِ افسوس ملتے رہے اور اُن کے اَپنے ہی شعروں سے اُن کی مرثیہ خوانی ہوتی رہی ؎

مرگِ میکش سے جو ہوا پیدا پُر کسی سے بھی وہ خلا نہ ہوا
کر گئے کوچ حضرتِ میکش ختم جب اُن کا آب و دانہ ہوا

میکش کاشمیری واصلِ بحق ہو گئے ہیں۔ اُن کی رحلت کے بعد اُن کے دو مجموعے تیار ہو گئے جن میں سے 'شہپرِ طاؤس' قارئین کے ہاتھوں میں آ گئی ہے۔ جبکہ ان کا چوتھا مجموعہ 'سازِ رگِ جاں' ترتیب و اشاعت کے دَور سے گزر رہا ہے۔ انشاء اللہ یہ کتاب بھی عنقریب ہی اُردو شاعری کے خزانے میں اضافہ کرے گی۔ شاعر تو یہاں کوئی کم نہیں ہیں لیکن دُوسرا میکشؔ کاشمیری پھر نظر آئے یہ بعدی از امکان بات لگ رہی ہے۔ وہ صاحبِ اِخلاص روپوش ہو چکا ہے۔ جس نے خود فرمایا ہے ؎

اِسی میں ہوگی خدا سے بھی گفتگو میکش
کہ روزِ محشر بھی ہوگی مری زبان اُردو

●

کہاں ملیں گے ایسے لوگ

جناب میکش کشمیری (مرحوم)

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں ریجنل ریسرچ لیبارٹری۔ جموں میں ملازم تھا تو ۱۹۵۴ء میں ریڈیو کشمیر۔ جموں نے ایک اُردو مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا۔ اس مشاعرہ میں لسان الاعجاز پنڈت میلا رام صاحب وفاؔ جیسی ہستیاں بھی شامل تھیں۔ خاکسار کو بھی اس میں مدعو کیا گیا تھا۔ میرے کلام کو بے حد سراہا گیا۔ اقبال سنگھ صاحب مجھے اس بات کی تحریک دی کہ میں ریڈیو کی ملازمت اختیار کروں۔ اس کے نتیجے میں لیبارٹری کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر ریڈیو میں بطور سٹاف آرٹسٹ شامل ہو گیا۔ میرا یہ خیال بھی تھا کہ ریڈیو ایک ادبی ادارہ ہے۔ وہیں جناب مےکشؔ کشمیری صاحب سے ملاقات ہوئی اور ملاقاتوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اپریل ۱۹۵۵ء کو میں نے سٹاف آرٹسٹ کی ملازمت ترک کر دی اور مستقل طور پر اکونٹس سیکشن کے عملہ میں شامل ہو گیا۔ حالانکہ یہ دونوں سیکشن مختلف نوعیت کے لئے مصروفیت کے باوجود ہماری ملاقاتیں متاثر نہیں ہوئیں۔ اگرچہ میں اکونٹس سیکشن میں کام کرتا تھا لیکن اُردو ریڈیو پروگرام

* ۵۳۔ ریشم گھر کالونی۔ جموں ــ ۱۸۰۰۰۱۔

میں مواتر شامل ہوتا تھا۔ اُس زمانے میں اُردو شاعری کے حوالے سے جو اہم نام تھے اُن میں جناب نرسنگھ سہائے شوقؔ، جناب منوہر لال دِلؔ اور جناب مےکش کشمیری تھے اُس زمانے میں جموں میں بزم اُردو ادب کی بُنیاد پڑی تھی ہم لوگ بزم کی ہفتہ واری نشستوں میں باقائدہ شامل ہوتے تھے بعد میں جناب اندر جیت لُطف بھی شرکت کرنے لگے۔ جہاں تک جناب میکش صاحب کی ادبی بصیرت کا تعلّق ہے اُس کی جس قدر داد دی جائے کم ہے وہ تعلیم کے لحاظ سے بی۔ اے اور منشی فاضل تھے اس کے علاوہ وہ انگریزی کے ایم۔ اے بھی تھے۔ انگریزی میں بھی وہ کافی ذہین تھے۔اُردو زبان پر اُنہیں دسترس حاصل تھی لیکن اس پر فارسی کا گہرا اثر تھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کا کلام فارسی تراکیب سے بھرا پڑا ہے۔ وہ شعر کہتے وقت فارسی کی تراکیب کو اہمیت دیتے تھے۔ اگرچہ اُن کا کلام وارداتِ قلب سے بہت دور تھا لیکن اس میں فنی لوازمات ہر جگہ نمایاں رہتے تھے۔ الفاظ کی تراش خراش سے اُن کی شاعری اور سنور جاتی تھی۔ اُن کی شاعری آورد کی غماز تھی۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ شعر ...... پر زور دے کر کہتے تھے۔

مےکش صاحب کثیر الاساتذہ شاعر تھے وہ جناب جوش ملیسانی صاحب کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے لیکن جناب ارچند قیس صاحب سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ انہیں اس بات کا صرف شدّت کے ساتھ احساس ہی نہیں بلکہ اعتراف بھی تھا کہ اُن کے کلام میں شعریت نہیں ہوتی۔ کئی بار قیس صاحب سے جب اُن کا کلام اصلاح ہو کر آتا تو اس ناچیز سے تبادلۂ خیالات کرتے اگر میں کوئی ترمیم پیش کرتا تو اُس کی تعریف کرتے اور یہ کہتے ہوئے اپنا لیتے کہ اب شعر میں شعریت پیدا ہوئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں

کہ یہ اُن کا بڑا پن تھا۔ موصوف غزل میں قافیہ کو بڑی خوبی کے ساتھ نبھاتے تھے۔ اُن کے کلام میں جگہ جگہ زبان و بیاں موجود تھیں۔ بلکہ وہ کلام سناتے وقت قافیہ نبھانے کی داد بھی طلب کرتے تھے۔ اور ساتھ میں یہ جواز بھی پیش کرتے تھے کہ اُنھوں نے فلاں لفظ کی جگہ فلاح لفظ کا استعمال کیوں کیا ہے۔ اس میں وہ حق بجانب بھی تھے۔ اسطرح اُن کی شاعری کاریگری کا بہترین نمونہ تھی۔

مے کش صاحب اپنے دوسرے مجموعۂ کلام "بالِ عنقا" میں رقم طراز ہیں:

"مجھے شاعروں کا یہ وطیرہ کھلتا ہے کہ وہ اپنے اساتذۂ کرام کا نام چھپائے ہوئے ہیں تاکہ ان کی جھوٹی آن، بان اور شان میں کوئی فرق نہ آنے پائے اور اُن کی اَنا ہی رہے۔ مگر انھیں یہ جان لینا چاہیئے کہ اس طرح وہ اہلِ نقد و نظر کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے۔"

حیرت ہے کہ مے کش صاحب خود بھی ایسے ہی شاعروں کی صف میں شامل ہیں! انھوں نے صرف اپنے اساتذہ جناب جوش ملسیانی اور ڈاکٹر امانت شیخ صاحب کا ذکر کیا ہے انھوں نے جناب امرچند قیس کا ذکر کرنے سے گریز کیا ہے جبکہ وہ باقاعدہ طور پر قیس صاحب سے بھی اپنے کلام پر اصلاح لیتے رہے ہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ مے کش صاحب میرے ساتھ کئی ریاستی مشاعروں میں شریک ہوئے تھے۔ اُن کا کلام اگرچہ پختہ ہوتا تھا لیکن اُن کا کلام پڑھنے کا ڈھنگ بے حد عجیب تھا۔ بعض اوقات وہ سامعین کے سامنے استعمال شدہ تراکیب کے بارے میں وضاحت شروع کردیتے۔ اسطرح وہ سامعین کے مذاق کا موضوع بن جاتے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے تحت الشعور میں یہ بات تھی کہ اُن کا کلام سامعین پر واضح نہیں اور

ایسا مشکل تراکیب کی وجہ سے ہے۔ اُن کی طبیعت کا رجحان مشکل پسندی کی طرف زیادہ تھا اور اس رجحان کو اُن کے نئے استاد پروفیسر امانت شیخ صاحب سابق صدر شعبۂ اُردو فارسی پونہ یونیورسٹی۔ پونہ نے مزید فروغ دیا جب انہوں نے مے کش صاحب کو اقبال کی ایسی زمینوں میں شعر کہنے کو کہا جن میں مشکل تراکیب عین ضروری تھیں۔ کسی زمانے میں مے کش صاحب نے شاعری ترک کرنے کا اعلان بھی کیا تھا اور کچھ دیر یہ سلسلہ جاری بھی رہا۔ اُس زمانے میں وہ اپنے آپ کو ''سوامی'' کہلانا زیادہ پسند کرتے تھے لیکن پھر شاعری کی طرف راغب ہو گئے۔ ع

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

مے کش صاحب نے اپنے شعری مجموعوں میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ اقبال کی تقلید کرتے ہیں اس صورت میں تقلید کرنے والے شاعر کی اپنی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے اُس کا ادبی وجود اُس شاعر کے وجود میں مدغم ہو جاتا ہے جس کی وہ تقلید کر رہا ہے۔ مے کش صاحب اس المیہ سے دوچار رہے ہیں۔ چونکہ انہوں نے مختلف رسائل میں اپنے کلام کی اشاعت کی طرف توجہ ہی دی اس لئے کسی تبصرہ نگار یا قاری نے اُنہیں یہ احساس نہیں کروایا۔ اس کا ایک منفی اثر یہ بھی ہوا کہ وہ اس میدان میں اپنی پہچان قائم نہ کر سکے۔ ہم کسی شاعر کا ادبی مقام تعین کرنے کے لئے اُن مشاعروں کا سہارا نہیں لے سکتے جو اُس شاعر نے پڑھے ہوں۔ پھر سرکاری مشاعروں میں تو مجموعی طور پر وہی ''لوگ'' شامل ہوتے ہیں جنہیں رسائی حاصل ہو۔ اور یہ رسائی برسرِ اقتدار سیاست دانوں تک ہونی چاہیئے۔ وہ ''بالِ ہما'' ہو یا ''بالِ عنقا''

دونوں مجموعے ایک ہی قسم کی شاعری کے حامل ہیں۔ انہیں پڑھتے وقت قاری کے ذہن پر اقبالؔ حاوی رہتے ہیں، مےکشؔ صاحب نے اقبالؔ کی زمینوں میں غزلیں ہی نہیں دو غزلے بھی کہے ہیں اور شعوری طور یہ کوشش کی ہے کہ ان میں وہی رنگِ سخن ہو جو اقبال کے ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مےکشؔ صاحب تقلید میں بے حد کامیاب ہیں وہ اس بات کیلئے بھی داد کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے ہر غزل میں قوافی کو نہایت خوبصورت ڈھنگ سے باندھا ہے۔ اُن کا یہ فن رُو بہ ترقی ہے اس سے اُن کی فنی مشاقی جگہ جگہ نمایاں ہے لیکن میکشؔ صاحب کو عام قاری سے اس کی داد نہیں مل سکے گی۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ شاعری قدیم یا جدید نہیں ہوتی، شاعر کا اسلوب بیاں اِسے اس زمرے میں رکھتا ہے۔ بعض اوقات بہت پرانا خیال اس انداز سے بیاں کیا جاتا ہے کہ اُس پر شک گزرتا ہے کہ یہ خیال ہے۔ لیکن جب تقلیدی شاعری ہو تو اُس میں یہ گنجائش نہیں ہوتی۔ کیونکہ شاعر کا ذہن ایک مخصوص سانچے میں ڈھل چکا ہوتا ہے۔ میکشؔ صاحب کے کلام پر ان کی علمیت کی چھاپ ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے علمیت کے زور پر ہی شاعری کی ہے۔ جب ہم نے میکشؔ صاحب نے جو قابلِ تعریف تراکیب استعمال کی ہیں اُن کا ذکر کیا ہے تو آئیے ایسی تراکیب سے لُطف اندوز ہوں۔

محرمِ سرِ زندگی ہے وہ کائنات میں
جس نے قدم جمائے رزم گہہِ حیات میں

(یہاں "محرم سرِّ زندگی" کی جگہ "محرم شرِ زندگی" لکھا گیا ہے)

یہاں ایک ایسا شعر بھی نظر سے گزرتا ہے جو بے وزن ہے یہیں نہیں کچھ

سکتا کہ مے کش صاحب کے اُستادِ گرامی کی نظر سے یہ شعر نہیں گزرا یا
جموں وکشمیر اُردو فورم کے ناظم کی اصلاح کے باعث ایسا ہوا ہے کیونکہ
آج کے دور میں اس قسم کے لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ شعر دیکھیے۔

ابھی وہ گناہی رہا ہوگا اُس کے بس کی بات نہیں
مری دُعاؤں کو اب تک جو کر سکا نہ معاف

اس شعر میں الفاظ کا رکھ رکھاؤ دیکھیے اور داد دیجیے ؎

پڑا عکسِ مہتاب جب جام پر
ہوا کیف صہبائے رنگیں دو چند

ایک خوبصورت خیال کو نہایت خوبصورت انداز سے بیان کیا گیا ہے۔
ایک قابلِ توجہ بات یہ بھی ہے کہ "دوچند" کو صحیح وزن پر نظم کیا گیا ہے۔
آج کے دور میں ایسا مُشکل ہے۔ نئی پود اس حقیقت سے نابلد ہے کہ لفظ
"دوچند" "دُچند" کے وزن پر ہے۔

یہ مطلع دیکھیے۔

ہو نہ اسیرِ حرص و آز، کوششِ خام سے گزُر
قابُو میں رکھ نفس کو تو دانہ و دام سے گزُر

میکش صاحب کی شاعری میں پند و نصائع کا عمل بھی ہے۔ موصوف
ریڈیو کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد درس و تدریس کے پیشے
سے وابستہ ہو گئے اور جموں کے ایک غیر سرکاری اسکول میں انگریزی کے
سینئر ٹیچر کے طور پر پڑھاتے رہے۔ وہ گھر پر بھی مختلف طلباء کو پڑھاتے
تھے لیکن ایک بات بڑی عجیب ہے کہ ریڈیو کی ملازمت سے
سبکدوش ہونے کے بعد انہوں نے ریڈیو کے کسی پروگرام میں حصہ نہیں

لیا۔ اگرچہ ریڈیو والے اُنہیں بار بار درخواست کرتے رہے۔
میں ۱۹۸۴ء میں بطور اِیڈمنسٹریٹیو آفیسر سِلی گوری (مشرقی بنگال) میں ریڈیو اسٹیشن پر تعینات ہوا تھا اس لئے ۱۹۸۸ء تک میکش صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ منقطع رہا۔ جب میں دوردرشن سرینگر سے ملازمت سے سبکدوش ہوکر جموں آیا تو گاہے گاہے اُن کے دولت کدے پر ملاقات کے لئے چلا جاتا تھا۔ میکش صاحب نہایت مہمان نواز تھے۔ وہ اکثر اس بات کا اعتراف کرتے کہ میرا کلام مختلف رسائل میں اُن کی نظر سے گزرتا رہتا ہے اور ایک الگ مزاج لئے ہوتا ہے اُن کی تعریف میرے لئے بڑی بامعنی تھی کیونکہ شاعری کے علاوہ وہ فنی لوازمات کو بڑی باریک بینی سے دیکھتے اور سمجھتے تھے۔
ایک روز خاکسار اور جناب خورشید کاظمی صاحب اُن کے دولت کدے پر ملاقات کے لئے چلے گئے۔۔۔۔ میکش صاحب نے بتایا کہ وہ دو روز کے بعد اپنے فرزند ارجمند کرنل سینچوکول کے پاس ممبئی جارہے ہیں۔ ممبئی میں قیام کے دوران میکش صاحب ۱۸ جنوری ۲۰۰۶ء کو انتقال کرگئے۔
موصوف علم و فن کا ایک روشن چراغ تھے۔ برسوں تک بزم اُردو ادب سے وابستگی کے بعد وہ ادبی سرگرمیوں سے دُور رہے۔ پھر بزم فروغ اُردو کی ہفتہ وار نشستوں میں شامل ہوتے رہے لیکن یہ سلسلہ دیر تک جاری نہیں رہا۔ انہوں نے چند برسوں سے اپنے اِردگرد سطحی قسم کے شاعروں اور غیر شاعروں کا حلقہ بنالیا تھا۔ میں جب اُنہیں اس لغزش کا احساس کرواتا وہ خاموش ہوجاتے۔
جب میں خورشید کاظمی کے ساتھ اُن سے ملنے گیا تو وہ دیر تک اپنے

تیسرے مجموعۂ کلام "آتشِ سیال" کا ذکر کرتے رہے۔ انہوں نے اس مجموعۂ کا جو انتساب کیا تھا وہ بھی کم و بیش ایک مختصر مضمون کی شکل میں تھا جب انہوں نے وہ پڑھ کر سنایا تو بڑی حیرت ہوئی کیونکہ انہوں نے اس میں مجموعہ کمپوزنگ کرنے والے کو "محسنِ اُردو" کے خطاب سے نوازا تھا۔ اس کے بعد وہ ساعت ہی نصیب نہ ہوسکی کہ اُن سے اس بارے میں کوئی بات ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میکش صاحب کے بارے میں کچھ بھی نہیں لکھا گیا۔ موصوف مختلف شخصیتوں کے مالک تھے اور اُن کی ہر شخصیت ایک پہلو لئے ہوئے تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جموں و کشمیر ریاست ہی نہیں بلکہ اُردو ادب نے ایک گراں مایہ ہیرا کھو دیا ہے۔ ہم جس کی وہ قدر نہ کرسکے جس قدر کا وہ مستحق تھا، ہمارے ہاں ویسے بھی ایک رواج ہے کہ کسی ادیب کی قدر اُس کے انتقال کے بعد کی جاتی ہے وہ بھی اُس صورت میں اگر کوئی مجبوری آن پڑے۔

بیاد کیلاش ناتھ کول میکش کاشمیری

میرؔ کا طرز تصور شعر میں غالبؔ کا رنگ
کیا تھی فکر شعر تجھ میں، کیا تھے اُسلوب واُمنگ

آبروئے شعر، میں تجھ کو کہوں، بے جا نہیں
تجھ سے قائم تھا غزل کی محفلوں کا رنگ ڈھنگ

کشتِ کشپؔ کے حسین باغات کے انمول پھول
تیرے بن پھیکا پڑا ہے تتلیوں کا شوخ رنگ

کہہ کے میکش ہم پکاریں یا تمہیں کیلاش ناتھ
گلشن کشمیر کہ یا بہتے جھرنوں کی ترنگ

جوشؔ[1] کا شاگرد تھا اور معتقد اقبالؔ کا
تیرے فکر و فن میں ظاہر ہے انہی کا رنگ ڈھنگ

نقطہ داں و نقطہ رس بیشک تھا تو نقطہ شناس
گونجتی ہے اب بھی محفل میں تیری آوازِ چنگ

کیا مے توحید سے لبریز تھا تیرا سخن
اپنی فطرت میں تھا یکتا اپنی مستی میں ملنگ

ہم زبان آزادؔ[2] و عابدؔ[3] اور طالبؔ[4]، نورؔ[5] سے
ہوتی ہوں گی محفلیں باغ جناں میں سنگ سنگ

☆

۱: جوشؔ ملیسانی، ۲۔ جگن ناتھ آزاد، ۳۔ عابد پشاوری، ۴۔ طالب ایمن آبادی، ۵۔ نور صدیقی

i) Residential Address / C/o Col. Sanjeev Kaul
Flat no. C - 452,
Raghunath Vihar,
KHARGHAR,
Navi Mumbai - 410210
xxxxxxxxxxxxxxxxxx 11. 1. '06.

ii) Official Address / Zee Ten Security & Detective Services (Regd.)
Head Office: 37 & 38, 1st. Floor,
Crystal Plaza, Hiranandani Complex,
Sector 7, KHARGHAR,
NAVI MUMBAI - 410210.
Ph. : 022-2786 7027 / 56109650

محبی و مشفقی گرامی قدر امین بنجارا صاحب تسلیم و نیاز

عکس تحریر: میکش کاشمیری

میکش کاشمیری صاحب کے آخری دو خطوط جو انہوں نے جناب امین بنجارا کے نام لکھے۔ ان خطوط میں جہاں میکش کاشمیری کی نثر نگاری کے عمدہ مرقع جلوہ گر ہیں وہیں ان کی نجی زندگی کے دو ایک اہم پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ۱۱ر جنوری ۲۰۰۶ء کو نوی ممبئی کھار سے لکھے ہوئے اس مکتوب کی نمایاں خصوصیت سرنامے پر درج سورۃ الشمس (گایتری منتر) ہے جو میکش کاشمیری کے روحانی مزاج کا غماز ہے۔

ॐ ۷۸۶

C/o Col. S. Kaul
Flat No. L-452
Raghunath Vihar,
KHARGHAR,
NAVI MUMBAI-410210.
12. 1. '06.

سالِ نو {ج + ن + و + ر + ی} نو
سنہ ۲۰۰۶ء

آیا ہے سال نو مگر بت گری ہے وسوسہ
اِس کا مآل بھی نہ ہو پچھلے ہی سال کی طرح

سخن دان و مہربانِ من بنجارا صاحب تسلیمات

بھلے ہی شاعر اپنی لغزش ہو اور ہم لاکھ خود کسی برتری کا دعویٰ کریں مگر حضور
اس تیسرے عمر ہوا بخلاف بھی ہو سکتا ہے ان غلطیوں کا پتلا ہے - اور سہو ہو جانے میں
کیا کمال ہے

لہٰذا آپ کو پھر تکلیف دے رہا ہوں۔ "ساز رگِ جاں" کی آخری غزل کا
بارہواں شعر درج ہے اور اس میں آخری لفظ "کیا" کے بجائے "گیا" کیا جائے تھا

مجھ کو بھی چلنے کا بنا ہوتا ہے در در بھی گیا
کاش تیرا بھی حال ہو میرے ہی حال کی طرح

درست فرمانے کی تکلیف دے رہا ہوں

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کون گاؤدی سیالکوٹ کا ہے۔ اگر صحت نے ساتھ دیا ہو تو ضرور
کبھی ملنے کا شوق بھی ہوئے گا۔

نیاز مند
طفلِ مکتب بارگاہ جناب دانا
میکش

میکش کاشمیری کا دوسرا آخری خط جو انہوں نے جناب امین بنجارا کو نوی ممبئی کھار سے لکھا۔ مکتوب ہذا بنجارا صاحب کو مورخہ ۲۱ر جنوری ۲۰۰۶ء کو موصول ہوا جبکہ ۱۹ر جنوری ۲۰۰۶ء کو میکش صاحب انتقال کر چکے تھے۔

(Stamped)

To: Aalijanab Amin Banjara Sahib,
267 - JOGI GATE,
JAMMU (Tawi) 180001

بگرامی خدمت محترم المقام عالیجناب امین بنجارا صاحب
۲۶۷-جوگی گیٹ-جموں (توی)
۱۸۰۰۰۱

[illegible]

32